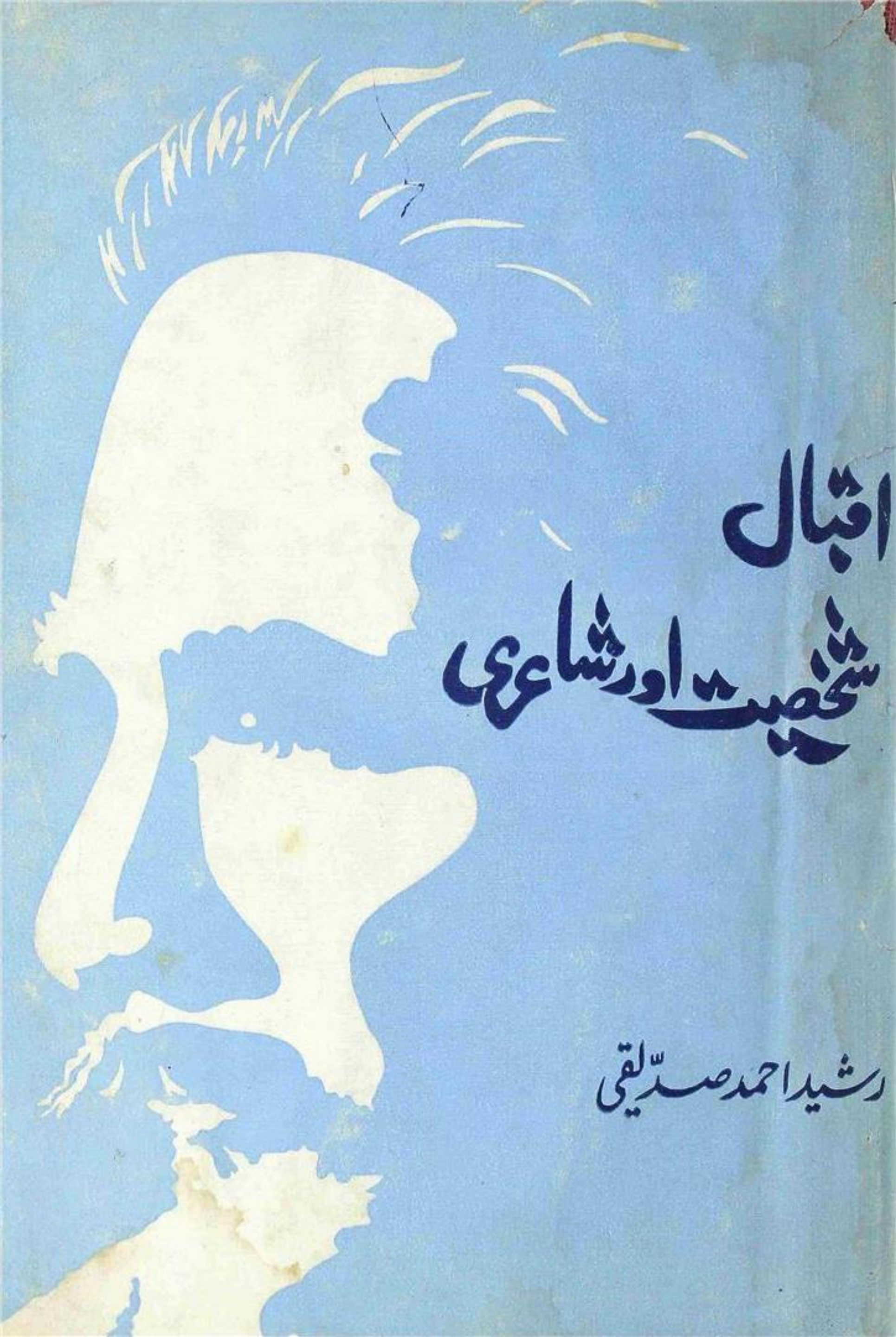

اقبال
شخصیت اور شاعری

رشید احمد صدّیقی

اقبال، شخصیت اور شاعری

رشید احمد صدیقی

اقبال صدی پبلیکیشنز نئی دہلی

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت اوّل ۱۹۷۷ء

قیمت =/۱۲ روپے

مطبوعہ جے. کے آفسیٹ پریس جامع مسجد دہلی ۶

تقسیم کار

مکتبہ روبی دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بیسویں صدی بکڈپو دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سکندر نیوز ایجنسی لال چوک سرینگر

عبداللہ رفوگر لال چوک سرینگر

دانائے راز

بسلسلۂ صد سالہ جشنِ ولادت حکیم الامت علامہ اقبالؒ

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	بیادِ اقبال	۱
۲	پیامِ اقبال	۲۴
۳	پیامِ اقبال	۵۸
۴	یومِ اقبال	۷۸
۵	اقبال اور ان کی شاعری	۹۵
۶	اقبال اور غزل	۱۱۴
۷	شاعرِ مشرق اور مسجد قرطبہ	۱۲۶
۸	اقبال اور غالب	۱۲۹
۹	متفرقات	۱۳۹

اظہارِ تشکر

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بلاشبہ وہ ان چند منتخب و منفرد صاحب طرز انشا پردازوں میں ہیں جن سے اردو زبان و ادب کا وقار قائم ہے۔

انہوں نے نہ صرف اپنے منفرد اسلوب اور ناقابلِ تقلید طرزِ تحریر سے اردو ادب کو مالا مال کیا بلکہ طنز و مزاح کی ایک الگ راہ نکالی اور اپنے لطیف طنز و خوشگوار مزاح سے میدانِ ادب کو زعفرانِ زار بنا کر دنیائے انشا پردازی کو فکر و فن کا سلیقہ بخشا۔

اقبال اکادمی، پاکستان، لاہور کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان کے پر مغز و بصیرت افروز مقالوں کو کتابی صورت میں شائع کر کے یہ قارئین کو پیش کر رہی ہے۔ یہ مقالے اور خطبات انہوں نے وقتاً فوقتاً، خاص خاص موقعوں پر پیش کئے جن سے اقبال کی شاعری اور شخصیت دونوں کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

یہ مقالے ان کے لائق و فائق فرزند پروفیسر ڈاکٹر احسان رشید شیخ الجامعہ کراچی یونیورسٹی نے ازراہ کرم و معارف پروری اکادمی کو عطا کئے اس طرح انہوں نے اقبال دوست اور قارئینِ اقبال دونوں پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ ان کو شائع کرنے میں اقبال اکادمی فخر محسوس کرتی ہے۔ اور ہمیں یہ سعادت نصیب ہوئی کہ یہ اہم کام ہمارے ہاتھوں انجام پا رہا ہے۔

ان مضامین کو اور پہلے چھپنا تھا مگر ع ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔ اقبال اکادمی کی کراچی سے منتقلی کے سبب تعویق ہوئی۔ مسودے کی ترتیب، تدوین، نیز کتابت شدہ

مسودے کی نظرِ ثانی کے لیے محترمی ڈاکٹر احسان رشید اور محبی جمیل الحق استاد شعبۂ اردو دانشگاہ کراچی کو زحمت دی گئی تھی۔ اراکین اکادمی ان دونوں حضرات کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ازراہِ عنایت اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود ہماری درخواست پر نہایت خندہ پیشانی سے یہ زحمت گوارا کی۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی فراخدلی ضرب المثل ہے۔ اور ان کی یہ ادب نوازی اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ ان کی فیاضی دور تک اثر رکھتی ہے۔ یہ مضامین اس ادیب کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ جنکی تحریر نئی نسل کے لیے بالخصوص ہم پاکستانیوں کے لئے تبرک کی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اسکی طباعت سے پاکستان اور ہندوستان کے ادیب برادری کے آپس کے رشتے زیادہ استوار ہوں گے۔

دست بدعا ہوں کہ خداوند تعالیٰ ان کو تادیر قائم رکھے تاکہ ان کی ادبی فیاضیوں کا سلسلہ جاری رہے۔

کرم کردی، سلامت باش

محمد معزالدین

بیادِ اقبالؒ

اقبال اُٹھ گئے۔ اُن سے قبل ان سے بڑے لوگ بھی رحلت کر چکے ہیں۔ لیکن اقبال ابھی ہم میں موجود تھے۔ ہم اُنھیں اپنی ہی طرح جیتے جاگتے۔ کھاتے پیتے۔ ہنستے بولتے دیکھ چکے تھے۔ دوسروں کا صرف کارنامہ ہمارے سامنے ہے۔ کارناموں سے زیادہ ہم ان اشخاص سے متاثر ہوتے ہیں جن کو ہم اپنی ہی طرح اپنے میں دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ شخص کی جُدائی سے شخصیت کی جدائی زیادہ شخصی ہوتی ہے اس لئے زیادہ بے چین کرنے والی بھی ہوتی ہے۔ پھر اقبال جو بحیثیت شخص اور شخصیت دونوں کے مدتوں ہم میں رہے کیسے بُھلائے جا سکتے ہیں۔

مجھے اس وقت اپنے بچپن کا زمانہ یاد آتا ہے جب صرف اچھی باتیں اچھی معلوم ہوتی تھیں اور اچھی باتیں وہی تھیں جو اپنے آپ کو اچھی طرح معلوم ہوتی تھیں اور کیسی اچھی باتیں وہ ہوتی تھیں اور کیسا اچھا زمانہ وہ تھا جب ہم کو صرف اچھے اور خوشگوار سے دلچسپی تھی۔ ان کے انجام سے ان کو مشتبہ یا مُضر قرار دینے کی تکلیف دہ استعداد پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جب زیادہ سے زیادہ اتنی سی بات ذہن میں پیدا ہو لیتی تھی کہ اگر کوئی آفت یا برائی کا سامنا ہوگا تو ماں باپ اسے سنبھال لیں گے ـــــ اقبال کی نظمیں پڑھ کر دل میں عجیب عجیب اُمنگیں پیدا ہوتی تھیں۔ سمجھ میں کم آتی تھیں۔ لیکن وہ باتیں جو کرداروں کی زبان یا وسیلہ سے کہتے تھے وہ بڑی دل آویز معلوم ہوتی تھیں۔ ان سے ہماری دوستی ہو جاتی۔ مجھے یاد آتا ہے اقبال کی مشہور اُردو نظم "خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا" بزرگوں کی ایک صحبت میں پڑھی جا رہی

لہ جوہر۔ اقبال نمبر۔ جامعہ ملیہ بار اول نومبر ۱۹۳۸ء

تھی ساری باتیں تو سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ قمر کے معنی معلوم تھے۔ کلی۔ چمن و بہار سے واقفیت تھی "چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا"، یاد ہو گیا نتیجہ یہ ہوا کہ چمن و بہار کا جب کبھی تذکرہ ہوتا یا اُن کا تصوّر آتا تو میرا دل امنڈ آتا۔ مجھے کبھی کبھی اقبال پر غصہ آتا اور کبھی ان سے شدید ہمدردی ہوتی کہ انہوں نے چمن و بہار کو کیوں تکلیف پہنچائی یا تکلیف پہنچنے دی۔ اس کے بعد یہ خیال آتا کہ اقبال نے چمن و بہار کو بچانے کی کوشش کی ہو گی لیکن کامیاب نہ ہوئے ہوں گے۔ خدا نے ایسی بات کیوں کہی۔ خدا کیسا ہے خوشی کی باتیں نہیں کرتا یا نہیں ہونے دیتا۔ خدا ہم بچوں کے مانند نہیں ہے بلکہ ہمارے بزرگوں کی مانند ہے جو ہنستے ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور خفا ہوتے ہیں تو ہم کو بُرا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی یہ محسوس ہوتا کہ خدا بچہ ہوتا تو کلی۔ بہار اور چمن کے ساتھ ایسا سلوک نہ ہوتا۔

زمانہ گذر گیا لیکن اقبال کا خیال دل سے نہ گیا۔ ان کے کلام کا منتظر رہتا۔ پڑھنا آگیا تھا۔ اس لئے جہاں کہیں اُن کی نظمیں مِلتیں ان کا مطالعہ ضرور کرتا۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں نے مدتوں اِس امر کا التزام رکھا کہ اقبال کی جو بات سمجھ میں نہ آئے وہ کسی سے پوچھی نہ جائے محض اس خیال سے کہ میں نے جن بنیادوں پر اپنی جنّت تعمیر کی ہے دوسرا اسے مسمار نہ کر دے۔ الفاظ اور فقرے سمجھ میں آتے تھے اصلی مفہوم متیقّن نہ ہوتا تو اپنی طرف سے مفہوم کی دنیا بناتا اور اس میں خوب گھوم پھر کر اور لطف اٹھا کے باہر نکل آتا۔ اسی زمانہ میں ایک مولوی صاحب "ما یقمان" اور محمود نامہ پڑھاتے تھے۔ فارسی کا وہ صرف تحتِ اللفظ ترجمہ کراتے جس کا مجھ پر بالکل اثر نہ ہوتا لیکن براہِ راست فارسی سے میں ایک معنی خود وضع کرتا اور ہمیشہ اُس معنی کی ایک دنیا۔ ایک تصویر خانہ بناتا اور اُس میں گھوم پھر کر خوش ہوتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ فارسی کا وہ کلام تو کسی

اور کا ہوتا لیکن اس کے مفہوم کی جو دنیا میں بناتا اس کے بارے میں یقین ہوتا کہ یہ اقبال کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ اس لئے یہ دنیا ڈیمک بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ یہ بچپن کی باتیں ہیں۔ اب تیس بیس سال بعد اس پر نظر ڈالتا ہوں تو ہنسی سی آتی ہے۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ ایسی ہی باتیں ہر بچے کے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نئی بات دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ پرانی باتیں صرف نئے ذہنوں اور نئے سانچوں میں مختلف پہلوؤں سے چرخ کھا کر نئے اسلوب اختیار کر لیتی ہیں اور اسالیب اَن گنت ہیں جو نہ ہوں تو دنیا فرسودہ ہو کر مٹ جائے۔

مرنے والے مرتے ہیں ان میں اپنے بھی ہوتے ہیں پرائے بھی۔ رنج و ماتم بھی کیا جاتا ہے۔ آخر اقبال کے لئے ہم رہ رہ کر کیوں غمناک ہو جاتے ہیں۔ اقبال کے رشتہ دار بھی ہیں دوست بھی اور معتقد بھی۔ رشتہ داروں کو یہ الم کہ اُن کا عزیز بچھڑ گیا۔ اُن کا سرپرست اور اُن پر جان چھڑکنے والا باقی نہ رہا۔ دوست یوں غمناک کہ رنج و راحت کا شریک باقی نہ رہا۔ جس کی صحبت میں وہ زندگی کا لطف اٹھاتے تھے۔ جس کی ہمدردی قابلیت۔ زندہ دلی اور رفاقت سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ آخر وہ لوگ کیوں حیران و حزیں ہیں جن کو اقبال سے براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ ممکن ہے ایسیوں کا کوئی خاص رشتہ ہو اس رشتہ کے ٹوٹنے کا غم ہو۔ یہ رشتہ بہت سے دوسرے رشتوں سے زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔ اس لئے اِس کا تعلق ذہنی و روحانی صداقتوں سے ہوتا ہے جس کو زوال نہیں۔ جن پر کسی کو قدرت نہیں۔ جن کو مٹانا یوں ناممکن ہے کہ ان کو ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا۔ ان کی تشریح نہیں کی جا سکتی۔ نسلیں بیت جائیں گی۔ زندگی کچھ کی کچھ ہو جائے گی۔ لیکن یہ تعلق قائم رہے گا۔ غم کی جگہ عظمت لے لیگی۔ اور یہی

عظمت دوسری عظمتوں کا زینہ بنے گی۔ ترقی اِسی کا نام ہے۔

موت کسی کا احترام نہیں کرتی۔ اِس سے سب ڈرتے ہیں سوا زندگی کے جو اپنے آپ کو موت سے زیادہ پائدار اور بامعنی سمجھتی ہے اِس لئے کہ خدا زندہ ہے۔ اُس کی مشیّت زندہ ہے اور زندگی اُس کی سب سے بڑی اور سب سے بلند حقیقت ہے۔ اقبالؔ نے اس زندگی کو حاصل کرنے کی تعلیم دی ہے۔ وہ اس حقیقت کو طرح طرح سے بیان کرتے ہیں۔ طرح طرح سے ذہن نشین کر لتے ہیں وہ اپنی اس تعلیم میں زندہ ہیں ——

میں نے کتابیں پڑھی ہیں۔ باتیں سُنی ہیں۔ صحبتیں اٹھائی ہیں۔ زندگی دیکھی ہے۔ غور و فکر کیا ہے۔ سب کا مجموعی اثر جو کچھ ہو سکتا ہے جسے میں تجربہ کے وسیع مفہوم سے تعبیر کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ مسلمان جو کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ مسخّر و مرعوب نہیں ہوتا۔ علم و فضل ہو۔ دولت و حشمت ہو۔ جاں سوزی و جاں بازی ہو۔ وہ سمجھتا ہے اور اُس پر یقین رکھتا ہے کہ بحیثیت مسلمان وہ اِن سب پر قادر رہا ہے اور رہ سکتا ہے۔ اس کے لئے اور اس کے نزدیک کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی اس کو بشارت نہ دی گئی ہو اور کوئی بشارت ایسی نہیں ہے جو اس پر پوری نہ کی گئی ہو ——

اِس حقیقت کا احساس افراد کو سنبھالنے اور جماعت کو منظم اور پائندہ کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ اقبالؔ ہم میں اُس وقت آئے جب ہم اپنی زبونی کی آخری حد تک پہونچ چکے ہیں۔ ہم کو اپنی باتیں۔ اپنے اسلاف اپنی روایات۔ اپنی استعداد اپنی تہذیب و تمدّن۔ اپنا علم و کمال۔ اپنا مذہب و اخلاق۔ غرض اپنا سب کچھ پست و ہیچ نظر آتا تھا ہم اُن سے شرماتے تھے۔ ہم میں اکثر ان کا مضحکہ اڑانے سے بھی

دریغ نہ کرتے تھے۔ پڑھے لکھے اور ترقی یافتہ لوگوں میں بیٹھ کر ہم اپنے علم وکمال۔ اپنے تمدّن۔ اپنے شعروادب کی آڑ پکڑنے سے شرماتے تھے۔ اقبالؔ نے اِس طلسم کو توڑ دیا۔

اقبالؔ نے زیادہ تر وہی باتیں کہی ہیں جو قرآن وحدیث میں ہیں۔ ائمہ کے اقوال میں ہیں۔ بزرگوں کے کارناموں میں ہیں۔ اب بھی ہمارا حال یہ ہے کہ اگر ہم یہ کہیں یا نہیں کہ قرآن میں یہ آیا ہے۔ رسولؐ کا یہ ارشاد ہے۔ بزرگوں نے یہ فرمایا ہے تو ہم پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔ لیکن بالکل انہیں باتوں کا جب اقبالؔ اپنی زبان سے اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں تو ہم وجد میں آجاتے ہیں۔ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اس کی آڑ پکڑتے ہیں اور اس پر اَڑ جاتے ہیں۔ یہ آخر کیوں ممکن ہے۔ اِس کا سبب یہ ہو کہ ہمارے ذہن ودماغ کے مختلف گوشے اور زاویئے ہیں۔ بعض چھپے ہوئے تار جب کوئی پہنچا ہوا اُن کو پہچان کر چھیڑ دیتا ہے تو پھر زندگی کے نغمے بیدار ہو جاتے ہیں اور بندھے ہوئے سوتے کھل جاتے ہیں اور ہم فوراً محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم بھی کچھ ہیں اور بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

دُور کیوں جایئے اپنی شعروشاعری ہی کو لے لیجئے۔ اُردو شعروشاعری کو آج سے پہلے ہم کیا سمجھتے تھے۔ ہمارے نزدیک اِس کی کیا حیثیت تھی "محض تفریحی"، ہم لُطفِ زبان کے بیان سے مَسرُور ہو لیتے تھے۔ کبھی کبھی تصوّف یا عشق کی باتوں یا گھاتوں کو سُن کر پایا کر جی بہلا لیا کرتے تھے۔ اقبالؔ نے اُردو ہی کو وسیلہ کار بنایا لیکن اپنے خلوص۔ اپنے اسرار۔ اپنے تجربات۔ اپنی ژرف نگاہی اور اپنے بصائر سے اس کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ اب ہم صرف الفاظ کی صنعت گری پر خوش نہیں ہوتے بلکہ اس طرح مُتاثر ومتحرک ہوتے ہیں جیسے کوئی بھولی ہوئی بات اچانک

یاد آجاتے۔ سوتی ہوئی استعداد بیدار ہوجائے اور بیدار شدہ استعداد عمل کا جامہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ اقبال کی شاعری نے اُردو شعر و شاعری کے مقررہ معیار کو زیر و زبر کر کے ایک دوسرا نہایت دقیع معیار وضع کر دیا ہے۔ انہوں نے اُردو کے لئے ایسا سکہ رائج کر دیا ہے جس کے لئے ہم کو نئی نئی متاع اور نئے نئے بازار فراہم کرنا پڑیں گے ایسا کرنے کا ولولہ ہم میں پیدا ہو چکا ہے۔

آج ہم ہی نہیں ساری دنیا یورپ کے کمالاتِ ذہنی و عملی پر ایمان لاچکی ہے اور کیوں نہ ایمان لائے۔ یورپ نے زندگی کو ایک مستقل معیار سے دیکھا جانا اور پہچانا اُس نے زندگی کو لڑ کر فتح کیا۔ اسے دیکھ کر نہ تو اس نے افسوس کیا اور نہ پیچھے ہٹا۔ اس نے زندگی کے راز دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی اس نے اس سے نپٹنے کی جد و جہد کی۔ لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ اس نے دنیا کے صرف اُن پہلوؤں کو پرکھا جو قوانینِ فطرت کے ماتحت تھے اُن کو نہیں جو ما فوق الفطرت قوتوں کے زیرِ نگیں تھے۔ وہ فطرت کے قوانین سے واقف ہوا لیکن اس کے "اسکرپچر" "SCIPTAIRE" (صحیفۂ الہام) سے بے بہرہ رہا۔ اس نے جن وسائل میں عواملِ فطرت کو سر کیا تھا انہیں وسائل کی مدد سے فضائلِ انسانی کو کو حاصل نہ کر سکا اور نہ اُن کی اہمیت کا قائل ہوا۔ یورپ کی اِس تسخیر کو ہم نے ہمہ گیر سمجھ لیا اور اس کی کوتاہی ناقابلِ التفات۔ یورپ وسائل کا موجد بھی تسلیم کیا گیا اور مختارِ مطلق بھی۔ اُس نے جن وسائل سے فطرت کو تسخیر کیا تھا ہم نے انہیں کو سب کچھ سمجھ لیا اور جو کچھ اس نے مسخر کیا انہیں کو تسخیر کئے جانے کے قابل سمجھا۔ یہی نہیں بلکہ یورپ کے ساتھ ہم نے یہ بھی یقین کر لیا تھا کہ دوسری نوعیت کے نہ تو وسائل ہو سکتے تھے اور نہ دوسری چیزیں مسخر کئے جانے کے قابل تھیں۔

اقبال جو کچھ کہتے تھے رازداں کی حیثیت سے کہتے تھے۔ ہم مغرب کا نام لے کر جب اور جس طرح چاہتے تھے مشرق کو سنگسار کر دیتے تھے لیکن اقبال کے کہے کو کس طرح ٹال سکتے تھے جو ہم سے زیادہ یورپ کو پرکھ چکے تھے۔ اقبال نے یورپ ہی کے حربے سے یورپ کا جواب دیا اور اس کے ساتھ ساتھ دنیا کے اُس بھولے ہوئے سبق کو پھر دُہرا دیا کہ انسان کے فرائضِ تسخیرِ فطرت ہی تک ختم نہیں ہو جاتے بلکہ انسانی زندگی کا مقصد کچھ اور بھی ہے وہ آفرینش کی تسخیر پر اِکتفا نہیں کرنا چاہتے تھے انھوں نے دنیا اور آخرت کو ایک بامعنی سلسلہ میں ربط دینے میں اصرار کیا۔ وہ حکومتِ ارضی کو نیابتِ الٰہی سے کمتر درجہ کی چیز سمجھتے تھے۔ اقبال کا عقیدہ تھا کہ زندگی کے عروج اور انسانی اِستعداد کو برگزیدہ بنانے اور دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک برگزیدہ تر مقصد پیشِ نظر ہو۔ آخرت کا تصور اسی مقصد کی ترجمانی کرتا ہے۔ آخرت نام ہے اُس تصوّر کا جو انسانی کارکردگی اور انسانی فضائل کو متوازن بھی رکھتا ہے اور مائلِ بہ حصول بھی۔ اقبال اِسی تصوّر کے مفسّر اور مبلغ تھے اور اِس تصوّر سے انھوں نے مغرب کے مقابلہ میں مشرق کو سربلند ہونے کی دعوت دی۔ ہم اس پر ایمان لائے ہیں۔

اقبال شاعر ہی نہ تھے بلکہ بہت کچھ اور بھی۔ یہ بات ان لوگوں کو کیسے بتائی و سمجھائی جائے جنھوں نے اقبال کو کتاب میں پڑھا ہو اور زندگی میں نہ دیکھا ہو۔ میں تو اقبال کے ظرف کا قائل ہوں کہ وہ کتنی بات جانتے پہچانتے تھے لیکن جس جگہ جس طور پر جم کر بیٹھ گئے وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لیتے تھے۔ میں نے ایک دفعہ کسی قدر گستاخ ہو کر ۱۹۲۵ء میں اُن سے کہدیا تھا "ڈاکٹر صاحب! آپ نے دنیا کو دھوکہ دے رکھا ہے۔ اِس فریب کو دنیا نے کبھی پا لیا تو کیا ہوگا"۔ یہ سُن کر مُتحیر ہو گئے لیکن مسکرا کر پوچھا "کیوں کیا بات ہے"؟ میں نے عرض کیا "ہم سب یہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے بڑی محنت

اور بڑے غور و فکر کے بعد اپنے خیالات اپنے اشعار میں قلمبند کر دیئے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ جو کچھ جانتے پہچانتے ہیں اُس کا عشر عشیر بھی آپ کے کلام میں نہیں ہے یہ تو بڑا ستم ہے کہ ہم صرف اتنا ہی جان کر اکتفا کر لیں اور آپ یہ غضب کر رہے ہیں کہ شعر و شاعری سے آگے نہیں بڑھتے آپ کی صحبتوں میں وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کی آپ کے اشعار میں محض کہیں کہیں دھوپ چھاؤں سی مِل جاتی ہے۔ حالانکہ آپ بات بات میں وہ نکتے بتا جاتے ہیں جو مدتوں مطالعہ کے بعد شاید نہ معلوم ہوتے۔"

ڈاکٹر صاحب بڑے زور سے ہنسے۔ سَر کُرسی کے تکیئے پر ڈال دیا۔ چھت کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر حُقّے کا ایک گہرا کش لے کر بولے، "دیکھو دنیا جس آفت میں مبتلا ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جو لوگ جانتے ہیں وہ پورے طور پر بتا نہیں سکتے اور جو لوگ نہیں جانتے وہ سب کچھ بتانے پر آمادہ رہتے ہیں اور بتاتے بھی رہتے ہیں۔"

اس کے بعد ایک عجیب انداز سے مسکرائے کہنے لگے "تو پھر کیا چاہتے ہو" اس کے بعد پھر ایسی بات بتائی جس کے بتانے کا یہ موقع نہیں ——!

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

بڑی گرمی پڑ رہی تھی۔ دور دراز کے سفر سے واپس آ رہا تھا علی گڈھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اُترا ہی تھا کہ ایک عزیز نے کہا ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے۔ بہت تھوڑی دیر کے لئے ایسا معلوم ہوا جیسے پلیٹ فارم کی ہر چیز موجود تو ہے لیکن اس کی نہ کوئی آواز ہے اور نہ اس میں کوئی حرکت۔ یہ بات صرف ایک آن کے لئے تھی ــــ "آسیائے گردشِ ایام" ایک آن کے لئے رک سی گئی لیکن فوراً ہی پھر رواں ہو گئی۔ زندگی اپنے تمام ہنگاموں کے رَواں دَواں نظر آنے لگی۔ مکان واپس آیا۔ نہ نہانا اچھا معلوم ہوا نہ کھانے کا جی ہوا۔ ہر چیز ہر شخص اجنبی سا معلوم ہونے لگا۔ تھوڑی دیر کے لئے کمرہ بند کر کے لیٹ گیا۔

ذہن نے ماضی کے اوراق ایک ایک کر کے پلٹنے شروع کر دیئے طفلی کا زمانہ یاد آیا۔ جب اقبال کے اشعار چُھٹپنے کی دوستی کی طرح مزے دار اور جاں نثار معلوم ہوتے تھے اور اقبال کے بارے میں یہ تصوّر تھا کہ وہ جو اشعار کہتے ہیں اُنہی میں رہتے بستے ہیں۔ اقبال کی صورت وہی ہو گی جو میرے اپنے تصورات میں بہت اچھی سی۔ بہت چاہنے والی۔ جادو گروں جیسی۔ کچھ عجیب سی۔

یہ بات بھی کچھ کم عجیب نہیں کہ اب بھی جب کہ ادراک و شعور ایک حد تک مکمل ہو چکا ہے۔ اچھے اشعار کا مجھ پر وہی اثر ہوتا ہے جو بچپن میں ہوتا تھا۔ اچھا شعر ذہن میں آیا نہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے معلوم نہیں کیا چیز۔ تصوّرات کو کہاں کہاں لئے پھرتی ہے ــــ وہی افسانہ و افسوں۔ وہی

روشنی و تاریکی۔ لذّت و اذیت۔ خوف و امید جو بچپن میں پیدا ہوتے اب بھی بیدار ہو جاتے ہیں۔ جہاں چاہتے ہیں لئے پھرتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں چھوڑ دیتے ہیں۔

۱۹۲۵ء میں مرحوم سے ملنے لاہور گیا تھا۔ اقبال کے کلام میں جو باتیں بچپن کے تجسّس میں دلچسپ معلوم ہوتی تھیں اب تجزیہ و تجربہ کی زد میں ناقابلِ فہم معلوم ہونے لگی تھیں۔ صرف پڑھنے اور اپنے طور پر لُطف لینے کی منزل سے گذر چکا تھا۔ پڑھانے کو پُرلُطف بنانے کا فرض عائد ہوتا تھا۔ شعر میں شاعر غالب نظر آتا تھا اور ہر دل آویزی تاثرات پر ہی نہیں بلکہ فکر و تجربہ کی صحت صداقت پر منحصر معلوم ہوتی تھی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں محسوس ہوا کہ خود شاعر کو دیکھا جائے۔ اُس کے اشعار ہی سے نہیں بلکہ اُس کی شخصیت سے بھی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاعر اپنی ترنگ میں جو چاہتا ہے کر دکھاتا ہے۔ یہ تو نسبتاً آسان ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ دوسرے کی ترنگ یا تذبذب سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کی ترجمانی کر سکتا ہے یا دوسروں کی تشفّی بھی۔

غالباً دن کے نو دس بجے ہوں گے۔ لاہور مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا۔ کپڑے پہن کر کسی مقدمہ کی پیروی میں جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ سیاہ عقدہ (بو) باندھتے کالر درست کرتے ہوئے برآمد ہوئے۔ گٹھا ہوا جسم۔ چوڑی چکلی ہڈیاں۔ مردانہ انداز۔ آنکھوں کی ساخت اور مونچھوں کی وضع کسی قدر تورانیوں جیسی۔ سوٹ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ مسکرانے میں آنکھوں کے گوشوں میں جھُرّیاں پڑتی تھیں جن سے ذکاوت و محبّت کا اظہار ہوتا تھا بڑی خوش دلی اور شفقت سے ہاتھ ملایا اور کسی قدر دیر تک ہاتھ میں ہاتھ لئے رہے۔ بھاری بھرکم لہجے میں بولے: "آپ ہیں جی۔ صدیقی صاحب" میں اقرار کرتا ہوں کہ مرحوم کا ڈیل ڈول اور حلیہ دیکھ کر متحیّر اور مرحوم کے اندر

تخاطب اور لہجہ سے کسی قدر متعجب۔ اتنے میں نوکر کو آواز دی اور پنجابی میں قلم لانے کو کہا۔ ق کا تلفظ سن کر پھر پریشان سا ہوا۔ علی گڈھ میں پنجابی تلفظ سے آشنا ہو چکا تھا۔ لیکن ذہن میں معلوم نہیں کیوں یہ بات جم گئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال اس طرح کی معذوری سے مستثنیٰ ہوں گے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ پہلے سے بنائی ہوئی بہشت کو یوں درہم برہم دیکھ کر مجھ پر جو اثر جس درجہ ہونا چاہئے تھا وہ نہ ہوا۔ مرحوم کچھ اس انداز سے ملے اور اب محسوس کرتا ہوں کہ خود ان کے تلفظ میں کچھ ایسا خلوص اور اُن کے ہاتھ ملانے میں وہ شفقت اور ناقابلِ بیان مروت و مرحمت تھی کہ سب کچھ بھول گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اقبال ایسے نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا۔ جیسے ایک نیا تجربہ۔ بڑا اچھا تجربہ حاصل ہوا جس کا میں مستحق ضرور تھا گو منتظر نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے لئے کمرہ میں آ بیٹھے۔ علی گڈھ کا حال دریافت فرماتے رہے۔ آواز بھاری تھی اور بلند ہونے کے ساتھ ساتھ زور اور صفائی بڑھتی جاتی تھی۔ میں نے اس خود اعتمادی کے ساتھ جس میں عالمانہ اور والہانہ دونوں انداز متوازی و متوازن ہوں کم لوگوں کو گفتگو کرتے سُنا ہے۔ مرحوم کی باتیں سنیئے بشرطیکہ وہ بات کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو فوراً محسوس ہوگا کہ ان کی باتیں صرف زبان سے نہیں ادا ہوتیں۔ وہ صرف الفاظ اور فقروں پر نہیں بھروسہ کرتے تھے بلکہ وہ باتیں کہیں دُور سے اور بڑی گہرائی سے آتی تھیں۔ گفتگو حشو و زوائد سے قطعاً پاک ہوتی تھی اور بحث اتنی واضح اور جامع ہوتی کہ وضاحت و جامعیت بجائے صنائع و بدائع معلوم ہونے لگتی تھیں۔ گفتگو کرنے میں ان کی آنکھیں نصف سے بھی کچھ کم کھُلی رہتیں۔ البتہ جب گفتگو میں گرمی اور روانی پیدا ہو جاتی تو آنکھیں پوری کھل جاتی تھیں اور چہرہ پر گرمی و روشنی کے آثار نظر آنے لگتے۔

شام کو دوسری مُلاقات ہوئی۔ اِتفاق سے اس وقت ایک نوجوان شاعر آ گئے جو کچھ دیر تک اپنا فارسی کلام سُناتے رہے اُن کی شاعری اور لہجہ دونوں پر جدید ایرانی رنگ غالب تھا۔ کچھ اور لوگ آ گئے۔ نوجوان کی گفتگو میں تعلّی زیادہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی مسلسل خاموشی کسی قدر بیزاری میں تبدیل ہونے لگی۔ کچھ دیر بیٹھے رہے دفعتاً اٹھ کھڑے ہوئے صحبت ختم ہو گئی۔ صرف دو چار اَصحاب بیٹھے رہ گئے۔ اندر سے دیر میں بر آمد ہوئے۔ چہرہ پر اَب بھی انقباض طاری تھا۔ تھوڑی دیر تک حقّہ کا ٹھہر ٹھہر کر کش لیتے رہے اس کے بعد فرمایا "نعمت کے مطابق انسان کو ظرف نصیب نہ ہو تو نعمت لعنت بن جاتی ہے" اس کے بعد کچھ اور لوگ آ گئے۔ اَب طبیعت بحال ہو گئی تھی۔ ہر ایک سے پُرسشِ حال کرتے وہ بھی اس طور پر نہیں کہ موسم اَچھا ہے یا بُرا۔ رسمی باتیں تو وہ کرنا ہی نہیں جانتے تھے۔ ہر ملنے والے سے اُس کے مشاغل اور اُس کا مخصوص دُکھ سُکھ سُنتے۔ لوگ مرحوم کے حلقہ میں معتقدین کی حیثیت سے ڈرے سہمے ہوئے نہیں بیٹھتے تھے بلکہ محبّت اور بے تکلفی کی فضا ہوتی تھی۔ ہر شخص اُن کی باتیں بڑی گہری توجہ سے سنتا اور خود بے تکلفی سے اپنی سُناتا۔

دوسرے دن پھر مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آج کہیں جانا نہ تھا۔ اس لئے اطمینان اور شفقت کے ساتھ باتیں شروع کیں۔ اس زمانہ میں مرحوم کے نظریہ فوق البشر کا بڑا چرچا تھا۔ بعض باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اس لئے اُن پر خاص طور پر اپنے شبہات کا اظہار کیا۔ مرحوم نے بڑے عالمانہ انداز سے اور انتہائی خوش دلی اور خود اعتمادی کے ساتھ جو اُن کی سیرت کا بڑا گراں پہلو تھا اظہار خیال کرنا شروع کیا۔ اس وقت جو چیز سب سے عجیب اور اچھی معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ مُشکل سے مُشکل مسئلہ کو مرحوم کس خوبی سے واضح کر دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے مسئلہ

میں کوئی پیچیدگی تھی ہی نہیں۔ عالمانہ و مخلصانہ نقطۂ نظر کی یہ کرامت ہے کہ بہت پیچیدگیوں اور غیر متوقع مسائل کا حل آسانی سے سامنے آجاتا ہے ___ اسی صحبت میں عورتوں کا درجہ۔ فوق البشر، بعثتِ نبویؐ کا وقت اور مقام۔ فقہ اسلامی میں اجتہاد کے مسائل پر تقریباً تمام دن گفتگو فرماتے رہے ___ میں نے اس بحث کا خلاصہ اپنے بعض گزشتہ مضامین میں جہاں تہاں کیا ہے لیکن ایک بات جس کا ذکر بار بار کروں گا وہ یہ ہے کہ مرحوم کو صرف سمجھ لینا یا یہ کہ ان کے خیالات یا تصوّرات تمام کے تمام اُن کے کلام میں مقید ہو چکے ہیں غلطی ہے۔ مرحوم کی فکرؒ نظر کا کم حصہ اُن کے کلام میں منتقل ہوا ہے۔ وہ بہت کچھ جانتے تھے یہی نہیں بلکہ اکثر ایسا محسوس ہوا جیسے بعض بالکل ہی نئی باتیں دورانِ گفتگو میں اُن پر کسی کوشش کے بغیر منکشف ہو گئی ہوں۔

فقہِ اسلامی میں اِجتہاد کے مسئلہ پر وہ انگریزی میں بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ مسودہ بھی ٹائپ ہو چکا تھا۔ فرمایا: "ان مسائل پر بعض مستند عُلماء سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہتا ہوں۔ کون لوگ ایسے ہیں جن سے رجوع کرنا سُودمند ہوگا؟" عرض کیا کہ "اِس کوچہ سے نابلد ہوں اس کے علاوہ کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے بیشتر علماء علمِ دین سے تو پورے طور پر واقف ہوتے ہیں لیکن موجودہ عہد کے اکثر مسائل کچھ ایسے پیچ در پیچ ہیں اور ماہرینِ فن ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اس لئے ان پر ہمارے علمائے کرام صحیح رائے قائم کرنے سے مَعذور ہیں۔ تو کچھ تعجّب نہیں جب تک یہ مسئلہ کی اہمیت و مصلحت نہ معلوم ہو اس وقت تک اس پر صحیح حکم لگایا کیسے جا سکتا ہے۔ خیال ہے کہ آپ کے سامنے مسائل کی جو نوعیت ہے اس پر اگر مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اور مولانا سید سلیمان ندوی صاحب سے رجوع کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ ٹھیک یاد نہیں کہ

مرحوم نے یہ فرمایا کہ وہ ان دونوں بزرگوں سے بتا دلۂ خیال کر رہے ہیں یا کریں گے۔ اتنا البتہ یاد ہے کہ دونوں کے بارے میں مرحوم نے بڑے اِعتماد کا اظہار کیا تھا۔

مرحوم کا ایک وَصف یہ تھا کہ وہ خطوط کا جواب جلد سے جلد دیتے اور جب تک بینائی نے ساتھ دیا ہر خط کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجتے۔ اِن خطوط میں رسمی تکلفات کو بالکل دخل نہ ہوتا۔ ہر بات کا جواب نہایت واضح اور جامع ہوتا۔ مُشکل اور نازک سے نازک مسئلہ میں بھی صاف گوئی سے کام لیتے۔ بڑے آدمیوں کی طرح یہ کمزوری نہ تھی کہ جوابات ایسے ہوں کہ موقع بے موقع کترا کے نکل جانے کا امکان باقی رہے اپنے جوابات پر بڑا اعتماد ہوتا اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ فلسفی مُفکر اور مُتدیّن ہونے کے علاوہ بڑے اچھے وکیل (بیرسٹر) بھی تھے جو کچھ کہتے یا لکھتے اُس میں جذبات کو اتنا نہیں جتنا کہ فکر و تدبّر کو دَخل ہوتا۔ اُن کی تحریر و تقریر دونوں میں ایک اچھے قانون شناس اور اچھی وکالت کرنے والے کا واضح رَبط ہوتا۔

اُن کی شاعری کا اِمتیازی پہلو بھی یہی تھا۔ جس طرح مسائل کی توضیح میں تدبّر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی تدبّر حکیم یا فلسفی کی بڑائی اور کامیابی کی دلیل ہے اسی طور پر جذبات کا احتساب کرنا اور اس کو مناسب و موزوں اسالیب میں ڈھالنا شاعر کی بڑائی کی دلیل ہے۔ اقبال کی شاعری شاعری کی معراج ہے۔ انھوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دیا ہے اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بخشا ہے۔ دونوں صورتوں میں اقبال کا آرٹ اور اِعتقاد دوش بدوش کارفرما ملتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی اُن کا کلام پڑھ کر ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اقبال کہاں اور کہاں تک حکیم اور کہاں اور کس حد تک شاعر ہیں۔ بلکہ حکیم اور شاعر! البتہ کہیں حکیم پہلے اور شاعر بعد میں اور

کبھی اس کے خلاف لیکن بالآخر دونوں) ایک دوسرے میں ممزوج یا ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اقبال نے ملکاتِ فطری کو بشری ریاضتوں اور ماورائی بصیرتوں سے ایک نئی حسین اور لازوال صورت بخشی۔ شاعر کا طبعاً شاعر یا مفکر کا طبعاً مفکر ہونا کوئی بہت بڑی بات نہیں۔ نعمت تو وہ توفیق ہے جو فطری استعداد کو بشری نعمت بناتی ہے اور غالباً یہی توفیقِ الٰہی انسانیت کو نہ صرف انسانوں کے ہاتھ ہلاک ہونے سے بچاتی رہتی ہے بلکہ انسانوں ہی کے ہاتھ انسانیت کو فوزِ عظیم پر فائز کرتی ہے

علی گڈھ میں ایک دن دوستوں کی صحبت میں حافظ کے مشہور شعر ؎

صد بادِ صبا ایں جا بہ سلسلہ رقصد | ایں است حریف اے دل تا باد نہ پیمائی

پر گفتگو ہونے لگی۔ اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہر ایک نے موشگافیاں کیں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ ڈاکٹر اقبال سے رجوع کیا جائے۔ چنانچہ مرحوم سے استصوابِ رائے کیا گیا۔ فوراً ہی جواب لکھ بھیجا۔ ہر رائے پر محاکمہ کیا اور آخر میں لکھا کہ "شاعر کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے مطالب کو ریاضیات کے اصول مدِ نظر رکھ کر پیش کرے۔ اس لیے شعر کے مطالب جدا گانہ بھی ہو سکتے ہیں البتہ متضاد نہ ہوں گے" آگے چل کر لکھا تھا کہ "کبھی کبھی شاعر اپنی واردات کا پورے طور پر خود استقصا نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ واقعہ بیان کرنے کے بجائے ایسی فضا کی طرف رہبری کر دے جس میں اس واقعہ کے پیش آنے کا قوی امکان ہو اور جہاں ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق اپنا اطمینان کر ے" آخر میں لکھا تھا کہ "شاعر کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ وہ مخاطب کو منطق سے نہیں بلکہ اُن رموز سے اپنا لے جو اُس کے شعر میں دھوپ چھاؤں کی کیفیت پیدا کر رہے ہوں۔ شاعرانہ رموز نہ منطقیانہ رموز ہوتے ہیں نہ فلسفیانہ بلکہ کچھ اور ہوتے ہیں"

۱۹۳۰ء میں بہت بیمار تھا۔ ڈاکٹر صاحب انہی دنوں یاد نہیں آتا کس سلسلہ میں علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ ایک دن صبح غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمایا اُس روز خاص طور پر بڑی تکلیف تھی مُشکل سے باہر آیا۔ مجھے افسردہ لہجے میں رک رک کر عرض کیا۔ "ڈاکٹر صاحب کاش اتنا بیمار نہ ہوتا کہ آپ کے دوسری جگہ قیام کرنے کی مایوسی اور شرمندگی اٹھانا پڑتی"۔۔۔ ہائے۔ "اُن کا وہ چونک کر لیکن فوراً ہی مُسکرا کر بڑے وقار اور شفقت سے اپنے لہجہ میں فرمانا" نہیں جی صدیقی صاحب۔ کوئی بات نہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے گا۔ اچھے ہو جاؤ گے۔ پھر لاہور آنا۔ مایوس کیوں ہوتے ہو۔ مایوس ہونے سے جانتے ہو ایمان میں خلل پڑتا ہے۔ اور اس سے اللہ کریم کی توہین ہوتی ہے۔ اچھے مسلمانوں کو اس کی احتیاط رکھنی چاہیئے"۔

اُس کے بعد دیر تک اِس انداز سے گفتگو کرتے رہے کہ میں اُن کی موجودگی میں بھول گیا کہ بیمار بھی تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آ نہیں سکتی تھی کہ میں تو اچھا ہو جاؤں گا اور ڈاکٹر صاحب اِس جہان سے اُٹھ جائیں گے۔ اکثر یہ خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس تکلیف[۱] میں رہ کر عالم بقا کو سدھارے کاش کسی وقت حاضر خدمت ہو کر اُن کے لئے وہ کر سکتا جو انھوں نے میرے لئے کیا تھا۔ پھر سوچتا ہوں مرحوم بہت بڑے آدمی تھے اُن کو مجھ جیسا معمولی شخص کیا تسکین یا تشفی دے سکتا تھا۔ وہ خاصانِ بارگاہ سے تھے۔ لیکن اس بات سے طبیعت مطمئن نہیں تھی۔ گو معجزے کا زمانہ نہیں رہا۔ لیکن محبت و خلوص میں اب بھی بڑی کرامات پوشیدہ ہیں۔ دوسروں کی وہ کونسی تکلیف ہے جس کو میں یا آپ محبت سے کچھ اور نہیں تو تھوڑی دیر کے لئے زائل نہیں کر سکتے۔

زندگی کے آخر عہد میں[۲] مرحوم کا توسّل دربار بھوپال سے ہو گیا تھا اِس تعلق کو پیدا کرنے میں سر سید راس مسعود مرحوم[۳] کی کوششوں کو

۱۔ مرض نقرس ۲۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء ۳۔ وزیر تعلیم ریاست بھوپال۔

بڑا دخل تھا۔ اقبال کو جن دقتوں کا سامنا تھا اَب اُس سے نجات ہو گئی تھی۔
دورِ آخر کی بعض مشہور نظمیں مرحوم نے بھوپال ہی میں لکھیں۔ بھوپال کا تہنا یہ کارنامہ میرے نزدیک اُن کارناموں میں سے ہے جن کو آئندہ آنیوالی نسلیں کبھی فراموش نہ کر سکیں گی۔ اگر افراد کے مانند اداروں کی بھی کوئی معاد ہے تو اسی ایک نیک کام کے صلہ میں بھوپال کی نجات اُخروی مُتیقّن ہے۔ اقبال کو غمِ روزگار سے نجات دلانا میرے نزدیک بہت بڑی سعادت ہے۔ چنانچہ اقبال کے بعض عقیدت مند سر راس مسعود مرحوم اور نواب حمید اللہ خاں بالقابہٗ[1] کی اس فرض شناسی اور علم دوستی کو اِن عزیز و گرامی ہستیوں کی اور بہت سی منزلوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگر انگریز قوم کے بارے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ برطانوی سلطنت سے محروم ہونا پسند کرے گی لیکن شکسپیر کو چھوڑنا گوارا نہ کرے گی تو میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی گراں سے گراں قیمت پر اقبال سے جدا ہونا گوارا نہیں کریں گے

مرحوم[2] کو سر سید راس مسعود مرحوم سے بڑی شیفتگی تھی۔ اسی طرح سر راس کو اقبال سے بڑا اشتغف تھا۔ لیڈی مسعود کو اقبال مرحوم سے جو عقیدت تھی اور جس طور پر ڈاکٹر صاحب کی صحت و آرام کا موصوفہ خیال رکھتی تھیں اُس کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھوپال میں بڑے اصرار کے ساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کر دیا تھا جو ہر صبح آدھ گھنٹہ تک لیڈی مسعود کو کلام پاک سناتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لیڈی موصوفہ کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہونے والی تھی۔ مرحوم فرماتے تھے کہ ایامِ حمل میں کسی خوش لہجہ قاری سے اگر ماں کلام پاک سُن لیا کرے تو بچہ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ ممکن ہے یہی خیال ہو جس کی بنا پر اقبال نے "ارمغانِ حجاز" میں دخترانِ ملّت کو یوں خطاب کیا ہے ؎

---

[1] والیٔ بھوپال۔ وفات سنہ ۱۹۶۰ء بھوپال۔ آپ کی صاحبزادی سابق ولیعہد بھوپال شہزادی عابدہ سلطانہ کراچی میں مقیم ہیں اور سیاست سے دلچسپی رکھتی ہیں [2] علامہ اقبال

زشامِ ما بروں آور سحر را
بہ قرآں باز خواں اہلِ نظر را
تو می دانی کہ سوزِ قراءتِ تو
دگرگوں کرد تقدیرِ عُمر را

مرحوم کا ملازم علی بخش اس پر مامور تھا کہ قاری صاحب آئیں تو لیڈی مسعود کو کلام پاک سننے کے لئے فوراً آمادہ کرے۔ مرحوم خود بھی خیال رکھتے تھے کہ یہ فریضہ پورا ہوتا رہتا ہے یا نہیں۔ ایک دن مرحوم نے علی بخش کو آواز دی کہ قاری صاحب آئے ہوتے ہیں۔ لیڈی مسعود کہاں ہیں۔ علی بخش نے قدرے آزردہ اور تلخ ہو کر اپنی زبان میں کہا قرآن کیا سنیں گی وہ تو صبح ہی صبح باغ میں پھول کاٹنے چلی جاتی ہیں۔ وہاں سے فرصت ملے تو آئیں۔ میں کیا کروں۔ مرحوم خاموش ہو گئے۔ فرمایا صبر۔ علی بخش صبر۔ یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے۔

اقبال کا یہی فیصلہ اور اتنا ہی جملہ اُن کی فکر و فرزانگی۔ شاعری و شخصیت اور اُن کا مجموعہ ان کی ماورائی بصیرت کا ترجمان ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اقبال ہم سے آپ سے اور بہت سے دوسرے لوگوں سے جو ہم سے آپ سے بڑے ہیں منفرد و ممتاز ہو جاتے ہیں۔ اور ان پہنائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن کی تشریح تو درکنار ان کا تصوّر بھی دشوار ہوتا ہے

یہاں ایک واقعہ مولانا محمد علی مرحوم کا بھی بیان کروں گا۔ مرحوم تحریکِ خلافت کے سلسلہ میں یورپ جا رہے تھے۔ ایک الوداعی صحبت میں کسی صاحب نے سوال کیا۔ کیوں جناب۔ راستہ میں دل بہلانے کی خاطر کوئی کتاب بھی ساتھ لے جا رہے ہیں۔ فرمایا کیوں نہیں۔ پوچھا معاف فرمائیے گا کیا دریافت کر سکتا ہوں کس کس قسم کی اور کون سی کتابیں ہیں۔ مرحوم نے فرمایا دو کتابیں کافی ہیں اور وہی رکھ لی ہیں۔ حاضرین ان کتابوں کا نام سننے کے لئے سراپا اشتیاق بن گئے۔ مرحوم نے اپنے خاص انداز میں فرمایا۔ ایک تو کلامِ پاک ہے اور دوسرا دیوانِ داغ۔

اسے ایک لطیفہ ہی کیوں نہ سمجھ لیا جائے تب بھی اس سے مولانا کی پُر تجمل شخصیت کی دلربائی کچھ بڑھ ہی جاتی ہے۔ یہاں کسی طویل نفسیاتی مذاکرہ کو راہ دینا نہیں چاہتا۔ اصل مقصد دو عظیم المرتبت شخصیتوں کی ذہنی پرواز و پرداخت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے لیڈی مسعود کے پہلے بچہ کی شیر خوارگی میں وفات پا جانے پر رنجور ماں کو تسکین و تشفّی کا بڑا اچھا خط لکھا تھا اور آخر میں یہ شعر لکھا تھا ؂

در چمن بود ولیکن نتواں گفت کہ بود
آہ! ازاں غنچہ کہ بادِ سحر اُو را نہ کشود

اُس کے بعد نادرہ پیدا ہوئی تو ڈاکٹر اقبال بھوپال میں تھے اور لیڈی مسعود اندور میں۔ نادرہ کی ولادت سے ڈاکٹر صاحب بڑے مسرور تھے اور اس کے دیکھنے کے بے حد مشتاق۔ تھوڑے ہی دنوں بعد لیڈی مسعود اطلاع دیئے بغیر بھوپال آگئیں۔ اتفاق سے سر راس مسعود اور سر محمد اقبال دونوں یکجا تھے۔ سر راس نے فرطِ اشتیاق سے آگے بڑھ کر بچی کو آغوش میں لینا چاہا سر اقبال نے آواز دی۔ نہیں۔ پہلا حق شاعر کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ ماں نے نادرہ کو ڈاکٹر صاحب کی گود میں دے دیا۔

اکثر خیال آتا ہے کیا نادرہ بڑی ہو کر کبھی اِس پر غور کرے گی یا نہیں کہ وہ نہ صرف بڑے باپ کی بیٹی ہے بلکہ جب وہ ماں کے پیٹ میں تھی اس کی نفسیاتی پرداخت کا اہتمام اپنے زمانہ میں اسلام کے سب سے بڑے* اور برگزیدہ شاعر نے کیا تھا اور آغوشِ مادر سے سب سے پہلے براہ راست وہ اسی شاعر کے آغوش میں آئی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے بڑے لڑکے جاوید اور بانو کی تربیت و نگہداشت کے لئے ایک جرمن خاتون کی خدمات حاصل کرلی تھیں یہ خاتون

میرے ایک عزیز دوست کی رشتہ دار ہیں اور کچھ عرصہ تک میری بیوی۔ بچوں کے ساتھ گھر کے ایک عزیز رکن کی حیثیت سے رہ چکی تھیں۔ مرحوم کے دریافت کرنے پر میں نے ہی تحریک کی تھی کہ یہ خاتون بچوں کی نگرانی و تربیت و تہذیب میں بہت مفید ثابت ہوں گی۔ اس سلسلے میں کچھ عرصہ تک خط و کتابت ہوتی رہی۔ میں نہیں بتا سکتا کہ مرحوم ان بچوں (جاوید و بالو) کی تعلیم و تربیت کی طرف سے کتنے فکرمند تھے۔ ان کو معاوضہ کی کمی بیشی پر مُطلق اصرار نہ تھا لیکن وہ خاتون کی سیرت و عقائد کی چھان بین میں اس درجہ کاوش کرتے تھے کہ بالآخر میں نے کسی قدر تھک کر لکھ دیا کہ آپ کا نقطۂ نظر سمجھ چکا ہوں۔ مزید گفتگو سے بہتر یہ ہوگا کہ امتحاناً انھیں دو ایک ہفتہ کے لئے اپنے ہاں بلالیں اور ان کے انداز و اطوار کو نظر میں رکھیں اس کے بعد فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ ان کا رکھا جانا مناسب ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب اس تجویز کو مان گئے اور جرمن خاتون جن کو ہمارے ہاں کے چھوٹے بڑے آپا جان کہا کرتے تھے لاہور پہنچ گئیں۔ ان کے پہنچنے کے بعد مرحوم کے جو خطوط آتے اُن میں ہر ایک میں ان خاتون کی شرافت، قابلیت دیانت و امانت، محبّت و مروّت کا ذکر ہوتا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو ان پر اتنا اطمینان و بھروسہ ہوا کہ رحلت کے وقت مرحوم نے ان دونوں بچوں اور سارے گھر بار کو خاص طور پر اُن کے سپرد کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات پر بہت سے لوگوں نے ان جرمن خاتون کا بڑے اچھے الفاظ میں اپنے مضامین اور بیانات میں تذکرہ کیا۔

مرحوم کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد لاہور گیا۔ میں نے جاوید اور بالو کو دیکھا۔ جاوید کسی قدر سیانا تھا ایک حد تک خاموش اور کم آمیز۔ کھُل کر ملنے یا بات کرنے میں تکلّف کرتا۔ مجھے معلوم تھا کہ مرحوم کو جاوید کس درجہ عزیز تھا اور وہ اس کو کیا دیکھنا چاہتے تھے اور جاوید اُن کے کلام

میں کہاں کہاں اور کس طرح جاری وساری تھا۔ لیکن کچھ ایسا محسوس ہوا کہ خود جاوید پر اس کا وہ اثر نہیں ہے جو ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن بالو مشکل سے ۶۔ ۷ سال کی عمر ہوگی۔ کیسی تندرست۔ چنچل۔ ذہین خوب صورت بھولی بھالی بچی۔ ایسی لڑکی جو صرف ڈاکٹر اقبال کی لڑکی ہو سکتی ہے۔

جرمن خاتون نے بتایا کہ ڈاکٹر اقبال کی وفات کے بعد ایک رات بالو حسب معمول میری چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ باتیں کرتی اور خاموش ہو جاتی۔ پھر باتیں کرنے لگتی۔ لیکن رہ رہ کر کسی الجھن میں مبتلا ہو جاتی۔ پوچھا۔" بالو آج کیا بات ہے تم اچھی اچھی باتیں نہیں کرتیں"۔ بالو نے کہا" آپا جان! ابا موجود تھے تو یہ چاند اور ستارے کتنے چمک دار اور اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اب یہ کیوں نہیں چمکتے

جرمن خاتون نے یہ بھی بتایا کہ خود مرحوم کو بالو سے عشق تھا۔ چنانچہ بالکل آخری زمانۂ حیات میں ڈاکٹر اقبال کا جی صرف بالو سے بہلتا۔ اور بالو بھی مرحوم سے اس طور پر وابستہ ہو گئی تھی جیسے مرحوم اس کی ماں۔ اس کی ہم جولی اور اس کا کھلونا سب ہی کچھ تھے۔ اس سلسلہ میں خاتون کا بیان ہے کہ جب مرض نے نازک صورت اختیار کر لی اور مرحوم پر ضعف کی وجہ سے اکثر غفلت طاری ہو جاتی تو ڈاکٹروں نے مریض کے کمرہ میں بالو تک کا آنا بند کر دیا۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ بالو نہیں معلوم کیسے ڈاکٹر صاحب کے کمرہ میں آ گئی جہاں کوئی اور نہ تھا۔ میں پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ڈاکٹر اقبال کے سینہ پر بیٹھی ہوئی بے تکلف بات کئے جا رہی ہے۔ میں گھبرا اٹھی۔ سر اقبال کی بینائی تقریباً زائل ہو چکی تھی۔ میں نے دبے پاؤں قریب جا کر بالو کو بہلا کر جدا کرنا چاہا۔ سر اقبال بول نہیں سکتے تھے۔ بڑی ہی نحیف آواز میں کچھ ایسا کہا اور اُن کی تقریباً آنکھوں میں کچھ ایسی جنبش ہوئی جیسے وہ چاہتے تھے کہ بالو کو ذرا دیر کے لئے جوں کا توں رہنے دیا جائے اُس کے اِس طرح موجود

ہونے سے جیسے ان پر ایک گونہ اطمینان سا طاری تھا اور زندگی کی ڈوبتی بجھتی ہوئی قندیل کو وہ اپنے جذبۂ مسرت سے ایک لمحہ کے لئے اور روشن کئے ہوئے رکھنا چاہتے تھے۔

یہ خاتون اب بھی جب کبھی سر اقبال کا تذکرہ کرتی ہیں تو گریہ گلوگیر ہو جاتا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے ایسا مخلص اور شریف انسان نہ دیکھا پہلے پہل پہنچی تو کھانے پر ڈاکٹر صاحب پورے یورپین کپڑے پہن کر آئے اور انھوں نے دسترخوان کے وہ آداب ملحوظ رکھے جو یورپ میں اونچے سے اونچے گھرانوں میں نظر آتے ہیں۔ پھر مجھ پر کچھ ایسا اعتماد ہوا کہ انھوں نے بڑی صفائی اور بڑے ہی لطف سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کو اس تکلف سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ صرف بنیان اور تہمد پہنے کھانے پر چلے آتے۔ جب تکلیف اور ضعف زیادہ بڑھا کمرہ ہی میں کھانا کھا لیتے۔ ان میں بھروسہ کرنے کا عجیب مادہ تھا میری کسی تجویز کو انھوں نے کبھی رد نہیں کیا اور گھر کے معاملات میں مطلق دخل نہیں دیا۔ وہ اپنے عزیزوں سے زیادہ کہیں زیادہ میرا اعتبار کرتے تھے اور مجھے اس کا فخر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اکثر فرمایا کہ تمہارے ہونے سے مجھے گھر اور بچوں کی طرف سے ایسا اطمینان و آرام ہے جس کا میں بڑا متمنی تھا اور جس کی مجھے بڑی ضرورت تھی۔

دوسرے دن ایک عزیز کے ساتھ مرحوم کے مزار پر حاضر ہوا۔ شاہی مسجد کی بائیں سمت اس مردِ قلندر کو آسودۂ خاک پایا یقین نہ آیا کہ یہ اس اقبال کی آرام گاہ ہے ؎

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ جس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

کچھ ایسا محسوس ہوا کہ بادشاہی مسجد کی پروقار ضخامت و قدامت اور اس کی مخصوص فضا اور روایات دماغ پر اس درجہ اور اتنا مستولی ہو جاتی ہیں کہ ذہن کسی دوسری طرف منتقل ہونے کے قابل ہی نہیں رہ جاتا چنانچہ بے اختیار دل یہ چاہنے لگا کہ اقبال کا مزار مستقل حیثیت سے کہیں

اور ہونا چاہیئے جہاں اقبال کے تصوّر میں مزاحم ہونے والی کوئی اور چیز نمایاں نہ ہو۔

مرحوم زندہ تھے تو اطمینان رہتا کہ کوئی نہ کوئی موقع نکال کر اُن سے مِل آؤں گا اور اس کا یقین تھا کہ ان سے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور معلوم ہو گی جو میرے ذہن کی اِستعداد کو شگفتہ کرے گی اور دل کے ولولوں کو بڑھائے گی۔ ذہن کی کچھ اُلجھنیں تھیں جن کے بارے میں یقین تھا کہ ڈاکٹر اقبال اُنھیں سلجھا دیں گے۔ کبھی محنت و مطالعہ سے بچنے کے لئے دل کو بہلا لیا کرتا کہ دماغ پاشی کیوں کی جائے کسی دن ڈاکٹر صاحب سے جا کر اطمینان کر لوں گا

وفات کی خبر ملی تو معلوم ہوا کہ وہ تمام ذہنی تصوّرات جن میں بعض دُھندلے تھے اور بعض گریز پا اور جن پر تعمیر کھڑی کر لینا میری زندگی کی کرامات میں سے ہوتا۔ اقبال کے اُٹھ جانے سے سب درہم برہم ہو گئے۔ اب نہ وہ ولولہ رہا کہ ان کا پھر سے تعین کیا جائے اور نہ یہ اُمید کہ اقبال جیسا رہبر ملے گا جو ان کی تشکیل و تزئین میں مدد دے گا۔

مرحوم اکثر ایسی باتیں بتا دیتے تھے اور اس طرح سے بتا دیتے کہ اس ایک بات سے بے شمار نئی نئی اور عجیب باتیں از خود برآمد ہونے لگتی تھیں اور کم سے کم مجھے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے میں ان کی اس بات سے بہت سی دوسری باتیں نکال سکتا تھا۔ پھر لطف یہ کہ یہ دوسری باتیں اصل بات سے کوئی واسطہ براہِ راست نہیں رکھتی تھیں۔ ان کی بتائی ہوئی باتیں نہ صرف نئے راستے کھول دیتی تھیں بلکہ ان راستوں پر مُجاہدانہ و مجتہدانہ انداز سے گرم رفتار رہنا بھی آسان اور دلچسپ ہو جاتا۔

اقبال دوسروں کے نزدیک کیسے ہی کچھ ہوں میرے لئے تو وہ بہت کچھ تھے۔ میں تو یہاں تک سمجھتا ہوں کہ بہت سے مقامات پر وہ خود اپنے آپ کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اگر یہ شاعری ہے تو پیمبری کیا ہے اور یہ پیغمبری ہے تو شاعری کا کیا درجہ ہے؟

پیامِ اقبال[1]

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

(اقبال)

اقبال کی شعر و شاعری مِن حیثُ الکُل اِس عالمگیر ہیجان اور اضطراب کا آئینہ اور نتیجہ ہے جو دنیائے اسلام پر عرصہ سے طاری ہے اس لئے قبل اِس کے کہ ہم براہ راست نفسِ مسئلہ پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہوں یہ بہتر ہوگا کہ ہم ایک سرسری جائزہ اِن حالات اور واقعات کا لے لیں جن سے اقبال کی شاعری کے ابتدائی اور ارتقائی مراحل وابستہ ہیں بنظرِ سہولت اِس مسئلہ کی ان دو نوعیتوں کا بھی ابتدا ہی میں تذکرہ کر دینا مناسب ہوگا جو اِس صورتِ حال کی نہایت وضاحت کے ساتھ ترجمانی کرتے ہیں۔ اوّل تو وہ واقعات جو بیرونی دنیائے اسلام پر گزر گئے اور دوسرا وہ اندرونی انقلاب جس نے بحیثیت مجموعی ایک ہندی مسلمان شاعر کی قلب ماہیّت کر دی۔ جہاں تک ہندوستان کی تاریخ کا تعلق ہے سلطنت مغلیہ کا زوال، غدر کی داروگیر، غیر ملکی فاتحین کا استیلا عام مسلمانوں کی تباہی، اُن کی اخلاقی، مذہبی، تعلیمی اور سیاسی شکست وریخت، مغربین کا عروج، ایسے واقعات تھے۔ جنھوں نے ہندی مسلمانوں کے لئے ہند کی سرزمین کو نہایت تنگ اور تکلیف دہ بنا دیا

---

[1] رسالہ "سہیل"، علی گڑھ ۱۹۲۶ء

تھا۔ لیکن جیسا معلوم ہے اسلام جغرافیائی حدود سے بالکل بے نیاز ہے۔

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

کی بنا پر اس کا مقصدِ رسالت دنیا کے ہر گوشے اور ہر کلمہ گو سے وابستہ ہے، اس لئے اس کی اُخوت اور عقیدت عالمگیر ہے۔ یہاں پہنچ کر ہر مسلمان طبعاً مجبور ہے کہ وہ تمام دنیائے اسلام کے حالات اور واقعات کا جائزہ لے۔ اور اُس کی تعمیر و تزئین میں ہر ممکن قربانی کے لئے مُستعد ہو جائے۔ پچھلی پچاس سالہ زندگی جن محرومیوں کی ترجمان تھی اُس کا اِقتضا تھا کہ وہ اپنے ماضی اور حال کی رودادِ حیات کا مطالعہ کر کے یک لخت بیدار ہو جاتا اور چونکہ بیداری اپنی گزشتہ جمود کا ردِ عمل ہوتی ہے اس لئے ان حالات کے ماتحت جو افعال صادر و سرزد ہوتے ہیں وہ ایک حد تک غیر متعین اور بسا اوقات اندیشناک بھی ہوتے ہیں۔ ہندی مسلمانوں پر جو حالت گزر چکی تھی یا جو اَب گزر رہی ہے اِس کا احساس ہم کو ہے اور اس پر اظہارِ خیال کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اس دوران میں بیرونی عالمِ اسلام پر جو حالت گزر گئی اُس نے ایک حد تک ہمارے ان معتقدات کو متزلزل کر دیا جو اب تک ہمارے نزدیک مسلمات میں شمار ہوتے تھے۔ مراکش۔ الجیریا۔ ٹیونس، طرابلس، بلقان، ٹرکی، عرب، فارس، مصر، تہذیبِ حجازی کے حِصن حصین تھے۔ لیکن زمانہ کی نیرنگیوں نے جو فی الحقیقت کچھ نہ تھیں۔ لیکن ہماری خود فراموشیاں اور ان کے تازیانے نے ان کو وہ بنا دیا جو لِسان القلب (غالب) کی زبان میں

یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

یا ترجمانِ حقیقت کے نزدیک

وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار؟

کا مُرادِف تھا۔

اب وقت آنے والا تھا کہ پکارنے والا پکارتا۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو
در سوادِ دیدہا آباد شو

شورشِ اقوام را خاموش کن
نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

بہر حال یہ شانِ نزول تھی ترجمانِ حقیقت کی۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ بیرونی اثرات کے علاوہ خود اقبال کے اندرونی اور ذہنی انقلابات کیا تھے اور کیوں تھے؟ جہاں تک اس صنفِ شاعری کا تعلق ہے جس کے اقبال علم بردار ہیں یا جو اب تبدریج عام ہو رہی ہے۔ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی شاعری عین مقتضائے وقت و فطرت ہے اگر اس کے تاریخی پہلو کو مدِ نظر رکھئے تو یہ کہنے میں کس کو تامل ہو سکتا ہے کہ جذبات نگاری، بلند پروازی، الفاظ اور فقروں کی مینا کاری و موسیقی اور اِن سب کے مجموعے کو سحر حلال بنا دینے والا، اردو میں ایک ایسی شاہراہ کھول گیا تھا جس کا کسی کو گمان بھی نہ تھا یعنی

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللہم ہم اسد اللیم

مجھے اپنے ایک بزرگ کے قول کا احترام ہے کہ اگر غالب نہ ہوتے تو حالی۔ اکبر اور اقبال بھی نہ ہوتے لیکن اس سے جو نتیجہ انھوں نے نکالا ہے اِس سے اِسی احترام کے ساتھ اختلاف بھی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حالی۔ اکبر اور اقبال نے جو پیغام پہنچایا ہے اور

جس کی بناء پر اُن کی شاعری دوسرے تمام شاعروں سے مُمتاز و مُتمائز ہے وہ بھی غالب کے حصے میں آنی چاہیئے بد اتہ میں غالب کو اپنے عہد کا ترجمان نہیں تصور کرتا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے اُردو کے بے مثل شاعر ہونے میں مجھے کبھی شک رہا ہو۔ ہر شاعر کی حیثیت اُس کی خصوصیات سے جانچنی چاہیئے۔ اس طور میں میر مومن۔ سودا، انیس۔ داغ۔ حالی۔ شبلی۔ اکبر۔ فانی۔ اقبال اور حسرت سب کو ایک مخصوص صنف اور اندازِ کلام کا اِمام تصوّر کرتا ہوں اور وہ بھی بغیر اِس امر کو معرض بحث میں لائے ہوئے کہ شیکسپیر ملٹن۔ ورڈس ورتھ۔ کیٹس۔ شیلی اور ٹنی سن کو اپنی اپنی جگہ پر کیا درجہ حاصل ہے۔

بہر حال یہ ایک ضمنی حیثیت تھی اس عقیدے کی جس کا ابھی ابھی تذکرہ کیا گیا تھا۔ یعنی وقت اور زمانے کے اعتبار سے اقبال کی شعر و شاعری بالکل برمحل واقع ہوئی ہے۔ ایک عالمگیر تباہی و بربادی کے بعد رُوحِ قومی جس طور پر بیدار ہوئی ہے یا بیدار کی جاتی ہے۔ اِس کا نمونہ اقبال کا عہد اور اقبال کی شعر و شاعری ہے۔ یہ بحث تو اقبال کی شعر و شاعری کے زمان اور مکان سے متعلق تھی۔ اب ہم کو اقبال کی شعر و شاعری کے ارتقاء و نمو کا جائزہ لینا چاہیئے۔

اقبال کی شعر و شاعری کی محض اِس طور پر تفتیش کرنی کہ وہ کہاں پیدا ہوئے تھے اور اُن کی ابتدائی تعلیم کہاں اور کیسے ہوئی اگر غور کیا جائے تو کسی حد تک اتنی اہم نہیں ہے جتنی اہمیت اس کو مسٹر فارسٹر نے دی ہے۔ اُن کا نظریہ ہے کہ اقبال پنجاب میں پیدا ہوئے جو ہند و مسلمانوں کے باہمی اختلاف و کشیدگی کے لیے مشہور رہے ہے انھوں نے اِس امر کا بھی اعادہ کر دیا ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری کی ابتدا

بجائے قومی رنگ کے مذہبی پہلو سے کی ہے اور حالی کی طرح اقبال کا بھی ابتدائی کلام اُن کے ہم مذہبوں ہی کے لئے ہے لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر مسلمان خواہ وہ زندگی کے کسی مرحلہ میں ہو اور اُس کا کوئی مشغلہ ہو فطرتاً مذہبی واقع ہوا ہے۔

اقبال اگر پنجاب کی سرزمین پر بھی نہ پیدا ہوتے تو جن حالات کے ماتحت، جس نہج پر اور جن شاعرانہ اور حکیمانہ انداز سے انھوں نے شریعت اسلامی کا مطالعہ کیا ہے اِس کا اقتضا یہی تھا کہ آج وہ دنیا کے سامنے اِسی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں۔ جس حیثیت میں آج ہم اِن کو پاتے ہیں۔ یورپ کا سفر اختیار کرنے سے پہلے انھوں نے جتنی نظمیں لکھی ہیں ان سے یہ پتہ لگانا ایک حد تک دُشوار ہے کہ ان کے جذبات ان شعلہ نوائیوں کے لئے بیدار ہوں گے جنھوں نے بالآخر "وادیٔ فاراں" کے ہر ذرّے کو "چمکا دینے" کی دعوت دی۔ اقبال کی شاعری ہندوستانی سیاست سے نہیں تو کم از کم ہندو مسلم کشاکش سے تو بالکل بے نیاز ہے اور یورپ کے ایک مُفتدر محقق کو اس طور پر سخت مغالطہ ہوا ہے مسٹر فارسٹر نے شکوہ کو اقبال کی ابتدائی نظم تجویز کیا ہے۔

"شکوہ، جواب شکوہ، ترانہ ملّی، بلادِ اسلامیہ، اور مسلم" وغیرہ ان کے تیسرے (موجودہ) دور میں تعین ہوئی ہیں اور یورپ سے واپس آنے کے بعد لکھی گئی ہیں اِس لئے یہ نتیجہ نکالنا صریحی طور پر غلط ہے کہ یہ نظمیں بالخصوص شکوہ اُن کے ہندو دوستوں کی دل شکنی کا باعث ہوئیں۔ اور اَس کی تلافی اقبال نے ہندی ترانہ لکھ کر کی۔

یہ بھی غلط ہے کہ اقبال نے بنا شوالہ ۱۹۱۴ء میں لکھا بقول مسٹر فارسٹر اقبال نے اپنے ہندو دوستوں کی آزردگی سے متاثر ہو کر ترانہ ہندی ہندوستانی بچوں کا قومی گیت لکھیں۔ یہ تمام نظمیں اقبال کی بالکل ابتدائی

دورِ شاعری کی ہیں دوسرے دور کی نظمیں وہ ہیں جو تقریباً تمام تر یورپ کے دوران قیام میں لکھی گئی ہیں۔ اور ان میں بھی کوئی نظم ایسی نہیں پائی جاتی جو پورے طور پر اُن کے تیسرے دور کی نظموں کی نقیب کہی جا سکے یورپ سے واپس آنے کے بعد ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۵ء تک جتنی نظمیں لکھی گئیں اُن میں کثرت سے ایسی ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے خفائے تخیل میں اسرار اور رموز کا ہیولیٰ مُرتّب ہو رہا تھا۔

سفرِ انگلستان کے دوران میں جس واقعہ نے سب سے پہلے اقبال کے قلب کو متاثر یا مجروح کیا وہ تہذیبِ حجازی کا مزار، سسلی کا باصرہ نواز جزیرہ تھا جس کا مرثیہ اقبال نے انتہائے جوش و شدّت کے ساتھ لکھا ہے یہ ایک مسلمان شاعر کے اس دل کی چوٹ تھی جس کی نظروں میں اسلام اور اس کے جاں نثاروں سے زیادہ کوئی محبوب نہ تھا دیکھئے ان پارہ ہائے جگر میں کیسے کیسے الماس ریزے ہیں۔

یہ محل خیمہ تھا اُن صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
آفرینش جن کی دنیائے کہن کی تھی اجل
جن کی ہیبت سے لرز جاتے تھے باطل کے محل
زندگی دنیا کو جن کی شورشِ قم سے ملی
مخلصی انساں کو زنجیرِ توہّم سے ملی
آہ اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اِس پانی کے صحرا میں ہے تو
ہے ترے آثار میں پنہاں کسی کی داستاں
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں

جس کی تو منزل تھا، میں اُس کارواں کی گرد ہوں
میں ترا تحفہ ہندوستان لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا

یہ بحث ایک حد تک ضمنی تھی لیکن اس کے متعلق اظہارِ خیال کرنا یوں ضروری تھا کہ اقبال کی مختلف نظموں کی صحیح تاریخ نہ معلوم ہونے کے سبب سے یورپ کے ایک مُقتدر فاضل کو مُغالطہ ہوا ہے جس کے نظریہ کو تسلیم کرنے کے بعد اقبال کے متعلق بعض ایسے انکشافات ہوئے تھے جن کو ان کی شاعری کی تاریخ میں داخل کرنا اقبال کے ساتھ انتہائی ناانصافی ہوتی۔

اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد اِس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اُن کے اوائل کی طالب علمانہ زندگی شعر و شاعری کے کیف سے آشنا تھی۔ لیکن اُن کے شاعرانہ اور ادبی ذوق کی ابتدائی تہذیب اور تکمیل کی بُنیاد داغ اور میر حسن کے ہاتھوں سے پڑی۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ اقبال کا مستقبل اَب تک غیر متعین تھا۔ اور یہ سر ٹامس آرنلڈ کا فیضانِ صحبت تھا۔ جس نے اقبال کے دل میں فلسفہ کا صحیح مذاق پیدا کردیا اور بہت ممکن ہے یہ سر ٹامس آرنلڈ ہی کا تصرّف رہا ہو جس نے اقبال کو یورپ سے دلچسپی پیدا کردی۔

اقبال کا عازمِ یورپ ہونا اُن کے شاعرانہ اور فلسفیانہ جذبات کے لئے ایک پیامِ ہیجان و طغیان تھا جو یورپ کی آب و ہوا میں پورے طور پر پیدا ہوگئے۔ رحمت و عافیت کی وہ فضائیں جو صرف مشرق میں نظر آتی ہیں۔ اغیار اکثر ان کو جمود و ظلمت کا مُرادِف قرار دیتے ہیں۔ کچھ لوگ تو اس صورت حال کو مشرق کی آب و ہوا کا رہینِ منت تصور کرتے ہیں۔ دوسرے اس کو مذہب اور مذہبیت کا ایک تحفۂ بے جان قرار دیتے

ہیں۔ بہت ممکن ہے ایسا ہو لیکن اس سلسلہ میں بے موقع نہ ہوگا اگر ہم اِس حقیقت کا سراغ لگالیں کہ آیا خود مشرق کے لئے بحیثیت مجموعی مذہب باعثِ رحمت ہے یا نہیں۔ وہ لوگ جو مذہب کو علم و حکمت کا دشمن تصور کرتے ہیں اِس کا جواب نفی میں دیں گے لیکن خود وہ سرزمین جو مذہب کو ترقی کے راستہ میں سنگِ راہ تصور کرتی ہے ایک ایسے مذہب کی تلاش میں ہے جو اس کو یورپ کے دیرینہ آشوب، تجارتی مُسابقت، جنگ وجدل اور "زبردست زیردست آزار" کے مُہلک انجام سے اِس کو نجات دلا سکے۔ سرزمینِ یورپ کا ہر انقلاب اور ہر محرومی، خواہ اُس کی کچھ نوعیت ہو اس بات کی روشن دلیل ہے کہ اس کے موجودہ نظریاتِ زندگی ناکامیاب ثابت ہوئے لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جہاں تک دنیاوی ترقیوں کا مدار ہے اور تھوڑی دیر کے لئے فرض کرلیا جائے کہ ان دنیاوی ترقیوں کو یورپ کے موجودہ مسلمہ معیار سے جانچنا چاہئے خود مشرق کو مذہب سے کیا فائدہ پہنچا۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ اول تو مشرق نے باوجود اِس کے کہ وہ مشرق تھا اور ان تمام روایات اسباب اور اِستعداد و میلانات کا حامل جن کے ماتحت اِس کی تعمیر و تہذیب ہوئی تھی اس نے یورپ کی تقلید کی یا یوں سمجھئے اِس نے یورپ کا اثر قبول کیا۔ دوسرے یہ کہ یورپ کی اس ہنگامہ زائی نے مشرق میں مذہب کا مفہوم بدل ہی نہیں دیا بلکہ اس کو مَسخ کر دیا۔ اِس طور پر نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کی محرومی مذہب کے عَدم احساس اور مشرق کا خسران مذہب کے غلط مفہوم سے وابستہ ہے اس سلسلہ میں ضمناً اس مسئلہ کو اٹھانا غالباً بے موقع نہ ہوگا کہ خود مذہب کیا ہے؟ مذہب نام ہے اس تعدیل کا جو انسان کی انتہائی کمزوریوں اور انتہائی قوتوں میں فرق مراتب رکھتی ہے اور ان کو مزوج کرتی رہتی ہیں عبدیت اور نیابت کا

مسئلہ اسی محور (تعدیل) پر گردش کرتا ہے یہ بحث اپنے تنوّعات کے اعتبار سے نہایت طویل اور معرکۃ الآرا ہے اِس لئے اس کو یہیں ختم کردیا جاتا ہے مذہب اور سائنس کی اِس جنگ نے جس کے ذمہ دار خود یہ دونوں اتنے نہیں ہیں جتنے ان کے گمراہ یا سادہ لوح علمبردار، دنیا کو ایک محشرستان بنا رکھا ہے اسی عالم اور اسی زمانے میں اقبال نے اپنے جذبات کو برانگیختہ نقاب کیا ہے۔

اقبال نے مذہب، فلسفہ دونوں کا عمیق مطالعہ کیا تھا مذہب کی کارفرمائیاں تو وہ دیکھ اور سمجھ چکے تھے اب ضرورت اِس امر کی تھی کہ کچھ دن اس سرزمین پر الف لوگوں میں بسر کئے جائیں جو فلسفہ اور حکمت کے مُدعی تھے اور جن کے نزدیک مذہب اپنی رسالت میں ناکامیاب ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں مذہب سے یکسر معرّا ہوکر محض مادہ اور قوت کی کارفرمائی کا نمونہ اگر کہیں اپنی انتہائی برہنگیوں کے ساتھ مشاہدہ کیا جاسکتا تھا تو وہ یورپ کی سرزمین تھی۔ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اقبال نے دنیا کے سامنے جو قطعی پیغام پیش کیا ہے وہ کُلیتہً ان مشاہدات اور تجربات کی بنا پر تھا جن کو انھوں نے یورپ اور یورپین مصنفین سے آشنا ہونے کے بعد ترتیب دیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیئے کہ اس طور پر اقبال نے یورپ یا یورپین مصنفین سے کوئی حقیقت مُستعار لی ہے مفہوم واضح نہ ہوسکا ہو۔ اس لئے یہاں اس کا ایک تفصیلی جائزہ لینا غالباً بے محل نہ ہوگا۔ عام خیال یہ ہے کہ اقبال کے "انسان کامل" (سوپرمین) کا ماخذ کمتر یا بیشتر نیٹشے ہے لیکن یہ خیال جس قدر عام ہے اسی قدر غیر صحیح بھی ہے خود اقبال کا بیان ہے کہ انھوں نے تصوف کے مسئلہ انسانِ کامل پر کم وبیش پچیس برس ہوئے لکھا تھا جب کہ نیٹشے کا گذر ان کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا۔ دوسری حقیقت

جو اس بیان کے جواز میں پیش کی جا سکتی ہے اور جس کا تذکرہ خود ایک یورپین مصنّف نے لکھا ہے کہ نیٹشے امارتِ نسلی کا قائل اور وجودِ باری کا منکر تھا۔ حالانکہ اقبال کے کلام کا ایک سطحی مطالعہ بھی اِس حقیقت کو واضح کر سکتا ہے کہ اقبال اور اسلام دونوں اس نظریہ کے مخالف ہی نہیں بلکہ دشمن ہیں اقبال کے نزدیک جو نیٹشے کی وقعت ہے۔ اس کا تذکرہ یوں کیا ہے،

از ہستیِ عناصر انسان دلش تپید
فکرِ حکیم پیکرِ محکم تر آفرید
افگند در فرنگ صد آشوب تازہ
دیوانۂ بکارگہِ شیشہ گر رسید

لیکن بعض حیثیت سے نیٹشے کے افکار مذہبِ اسلام سے بہت قریب ہیں جس کا اقبال نے یوں اعتراف کیا ہے۔

آنکہ بر طرحِ حرم بت خانہ ساخت
قلب او مومن دماغش کافرست

اِس کے افکار کے متعلق اقبال کی ہدایت یہ ہے۔

خویشتن را در نہاد آں نمرود سوز
زانکہ بستانِ خلیل از آذرست

رہا یہ امر کہ ممکن ہے دوسرے شعرا یا مصنفین کے اقبال معتقد ہوں اِس کے متعلق یہ نقشِ فرنگ پیش کر دینا کافی ہوگا۔ "دانایانِ فرنگ" یوں مخاطب کئے گئے ہیں۔

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری
عجب این ست کہ بیمار تو بیمار نرست
خواجہ را قیمت عیش ست اگر مزدِ غلا
بندہ آزاد نزد خواجہ گرفتار نرست

پہلا شعر اِن لوگوں کے لئے ایک پیغام بصیرت ہے جو یورپ کی تعلیم و ترقی پر سر دھنتے ہیں، حالانکہ وہ اس حقیقت پر کبھی غور نہیں کرتے کہ ان تمام ذہنی اور مادّی نام نہاد ترقیوں نے یورپ کے انسانوں اور انسانیت کو کس سطح پر پہنچا دیا ہے۔ ترقی کا معیار یہ ہے کہ کس ملک اور کس قوم کی زیادہ سے زیادہ تعداد نے ایسی ترقی کی جو اپنے اور دوسروں کی کامرانی و عافیت کا باعث ہوئی۔ اس نظریہ کے ماتحت اگر یورپ کی ترقی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا اِس کی حالت کسی طور پر قابلِ رشک نہیں ہے۔ ممکن ہے مشرق کی موجودہ حالت بھی قابل اطمینان نہ ہو اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے لیکن اِس کا باعث یہ نہیں ہے کہ ہم مغرب کی تقلید نہیں کرتے۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ مشرق کی محرومی ایک بڑی حد تک مغرب کی تقلید کے سبب سے ہے مغرب کی جو شے ہم کو مسحور کئے ہوئے ہے وہ فی الحقیقت مغرب کی کمزوریاں ہیں۔ ہماری نظر مغرب کی خوبیوں پر نہیں پڑتی اُس کا سبب محض یہ ہے کہ ایک پست اور درماندہ قوم دوسری قوم کی کمزوریوں کی سہولت کے ساتھ تقلید کر سکتی ہے اور چونکہ خوبیوں کی پیروی زیادہ محنت، کاوش صبر و استقلال کی طلب گار ہوتی ہے اس لئے کمزور اقوام یا افراد اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

اقبال نے ایک مقام پر جلال اور ہیگل کا موازنہ کیا ہے موقعہ یہ ہے کہ اقبال کا ہیگل کے فلسفہ میں غوطہ لگانا تھا کہ

کشتی عقل گشت طوفانی

معاً پیر یزدانی نے نمودار ہو کر آواز دی

بہ سرابے سفینہ می رانی

اور آخر میں یوں بحث ختم کر دی

بہ خرد راہِ عشق می پوئی؟ بہ چراغ آفتاب می جوئی؟

اِن مثالوں سے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں ہے کہ اقبال "دانایانِ فرنگ کے سہرے سے منکر ہیں بائرن نپولین اور گوئٹے وغیرہ کی انھوں نے نہایت کشادہ جبینی کے ساتھ پذیرائی کی ہے گوئٹے اور جلال آرم میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ پیر عجم، نے "نکتہ دانِ المنی" کی یوں ستائش کی ہے۔

گفت رومیِ این سخن را جاں نگار

تو ملک صیداستی یزداں شکار

فکرِ تو در کُنجِ دل خلوت گزید

ایں جہانِ کُہنہ را باز آفرید

سوز و سازِ جاں بہ پیکر دادہٗ

در صدف تعمیرِ گوہر کردہٗ

ہر کسے از رمزِ عشق آگاہ نیست

ہر کسے شایانِ ایں درگاہ نیست

داند آں کو نیک بخت و محرم ست

زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم ست

"دیارِ مغرب" میں اپنے متموج جذبات کا اظہار اقبال نے اپنی ایک مشہور نظم میں کیا ہے۔ جس کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دوکاں نہیں ہے

کھرا جسے تم سمجھ رہے تھے وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مُدعا تیری زندگی کا

تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا

یہ نظم تھی اِفتتاحیہ اُن خیالات اور پیغامات کی جنھوں نے بعد میں اسرارِ خودی"

رموزِ بے خودی" اور پیغامِ مشرق" کا جامہ اختیار کرلیا۔ اس نظم کے مفہوم کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد یہ تیقن کرنا بالکل آسان ہوجاتا ہے کہ اقبال نے یورپ کی تعلیم و تلقین کے سامنے سرِ خم کیا یا نہیں؟ البتہ ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اقبال نے یورپ کے قیام میں کیا کیا اور اس کا اثر کن نوعیتوں سے اُن کے کلام پر پڑا۔ کیمبرج میں رہ کر اقبال کو آرنلڈ۔ ڈاکٹر میک۔ ٹیگرٹ، براؤن۔ نکلسن اور سارلے کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ یہ ہستیاں جس پایہ کی ہیں اسے مدِ نظر رکھتے ہوئے اُن نقوش کے متعلق زیادہ کدوکاوش کرنے کی ضرورت نہیں باقی رہتی۔ اقبال کی علمی زندگی جن اثرات کی سب سے زیادہ رہینِ منت رہی وہ خود ان کا مطالعہ اور مشاہدہ تھا۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ رہنمو ت تھے۔ اقبال کے لئے یہ موقع نہایت غنیمت تھا ایک طرف تو وہ فارسی فلسفہ اور تصوّف کا عمیق مطالعہ کر رہے تھے۔ دوسری طرف یورپ کا میدان رستخیز اُن کی نظروں کے سامنے تھا۔

مغرب کے جن واقعات اور حالات نے اقبال کو مخصوص طور پر متاثر کیا۔ مختصراً حسبِ ذیل ہو سکتے ہیں۔

۱۔ لامذہبی
۲۔ مادیت کا استبداد
۳۔ سرمایہ دار اور مزدور
۴۔ شہنشاہیت یا جوع الارض
۵۔ عسکریت
۶۔ سیاسی خداعت
۷۔ نوعی ہمدردی اور اخوت کا فقدان
۸۔ سائنس کی محشر زائیاں

اس کے ساتھ ساتھ مشرق کے یہ حالات پیشِ نظر تھے۔

۱۔ مذہب کا غلط مفہوم اور اُس کی غلط تاویلات
۲۔ علم و حکمت سے بیزاری
۳۔ محکومی اور غلامی
۴۔ مذہبی اور قومی مناقشات۔
۵۔ افلاس و کس مپرسی
۶۔ مغرب کی چیرہ دستی
۷۔ کورانہ تقلید

اِن امور کے ذہن نشین کرنے کے بعد اقبال کی ذہنیت کا پتا لگانا آسان ہو جاتا ہے مشرق پر جو کچھ گزر رہا تھا۔ اور اس کے جو کچھ نتائج تھے۔ اقبال اُن سے کافی آشنا ہو چکے تھے ان کے سامنے اب یہ مسئلہ تھا کہ وہ کون سی چیز ہے جس نے مشرق کو اس درجہ پست کر دیا اور بحالت موجودہ جو باتیں مشرق کی محرومیوں میں شمار کی جاتی تھیں اُن کو ترک کر دینے کے بعد اگر کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا جاتا (یعنی مغرب کی تقلید) تو صورت حال میں کوئی مفید تبدیلی پیدا ہو سکتی تھی یا نہیں؟ اِس طور پر اقبال کے لئے مغرب کی زندگی کا مُطالعہ کرنا لازمی ہو گیا لیکن ان کو جیسا کہ اِس مضمون میں کہیں عرض کیا جا چکا ہے جلد محسوس ہو گیا کہ "متاعِ یوسفی" ارضِ مغرب سے بھی ناپید ہے۔

یورپ کے مذہبی میلانات کے متعلق صرف ایک واقعہ کا تذکرہ غالباً یہاں کافی معنی خیز ہو گا کہ ایک زمانہ میں کسی ستم ظریف نے پریس میں یہ سوال پیش کیا کہ دنیا میں اب تک سب سے بڑی ہستی کون گزری ہے۔ اس پر ووٹ لئے گئے۔ سب سے زیادہ ووٹ شیکسپیر کو ملے۔ جناب مسیح کو نسبتاً اتنے ووٹ بھی نہیں ملے جتنے پچھلے سال انگلستان کی لبرل جماعت کو ملے تھے۔

اب رہی مادّہ پرستی علم و حکمت نے جن انسانی قابلیتوں اور صلاحیتوں کو آج بیدار کر دیا ہے ان سے کون آشنا نہیں۔ نوامیسِ فطرت کو جس طور

پَر اُنھوں نے بے نقاب کیا ہے اور

بَر عناصر حکمراں بودن خوش ست

کا جو نمونہ مغرب نے پیش کیا ہے وہ ہمارے سامنے ہے اور ہم میں کثرت سے ایسے لوگ مِل جائیں گے جو اُن کی اِس سرفروشانہ سعی و کاوش کی داد دینے کے لئے آمادہ ہوں گے۔ لیکن اس کا مقصد اہلِ مغرب کے نزدیک جو کچھ ہے اگر غور کیا جائے تو وہ ہی وہ حقیقت ہے جو موجودہ

آشوبِ بلا کوئے فتنہ چنگیزے

کی محرک اعظم ہے۔ ایجاد کا جہاں تک دَخل ہے ہماری گردنیں مغرب کے سامنے خم ہونے کو تیار رہیں۔ لیکن چونکہ ان کے ذہن و دماغ میں وہ عناصرِ عبودیت نہیں ہیں جو آشوبِ حیات میں اعتدال پیدا کیا کرتے ہیں۔ اور جن کو ایک مشرقی مذہب کے نام سے تعبیر کرتا ہے ان کی یہ ساری ایجاد و تحقیقات، انسان کی عافیت اور سکونِ خاطر کے لئے ایک خطرہ عظیم ہے جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ کسی تنگ خیالی یا تعصب کی بنیاد پر نہیں ہے تاہم ممکن ہے اِس سے بعض طبائع بدگمان ہوں اس لئے اس مسئلہ کو کسی قدر وضاحت سے بیان کر دینا غالباً بے محل نہ ہوگا اور اقبال کے پیامِ شاعری کی روح سے آشنا ہونے کے لئے اِن حقائق سے باخبر رہنا لازمی ہے۔

جنگ اور اَمن بعض اَضافی حیثیات رکھتے ہیں۔ ہر جنگ تعمیر کی اور ہر اَمن تخریب کا موجب ہو سکتا ہے لیکن مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ اس تعمیر یا تخریب کے ذمہ دار کون سے جذبات ہیں۔ انھیں جذبات کے تجزیہ پر جنگ کی تعمیری یا تخریبی حیثیت کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اِس نظریہ کے ماتحت اگر یورپ کے جنگ و جدل پر نظر ڈالی جائے (اور یہاں ہم کو صرف یورپ کا جائزہ لینا ہے) تو معلوم ہوگا کہ ان کے محرکات اعظم صرف وہ میلانات ہیں جو اکثر و بیشتر طمع و خود غرضی پر مبنی ہوتے ہیں۔ یورپ کی حربی ذہنیت پر غور

کرنے سے معلوم کر سکتا ہے کہ اس کی تمام کوششیں صرف اِس مقصد کے لئے ہوتی ہیں کہ اگر جنگ کی نوبت آجائے تو جنگ کو صلح میں تبدیل کرنے کے بجائے فریقین ہلاکتوں کا دامن کس حد تک وسیع کرنے پر قادر ہیں۔ مغرب نے اقوامِ عالم یا خود آپس میں صلح قائم رکھنے کی کب اور کس حد تک کوشش کی ہے ایک عریاں راز ہے جس کی تفصیل تحصیل حاصل ہے۔ ممکن ہے کچھ تاریخی مثالیں پیش کی جائیں کہ فلاں موقع پر صلح قائم رکھنے کی کوششیں کیں لیکن دنیا جانتی ہے آج کل کی قوتیں صلح یا جنگ کا اقدام صرف اپنے بازوؤں کی تاب وسکت کا اندازہ کرکے کیا کرتی ہیں۔ ظاہر ہے اس قسم کی صلح یا جنگ اخلاقی معیار پر کہاں تک ٹھیک اُترتی ہے۔ مغرب میں صلح کا مفہوم اکثر تیاری جنگ کی مُہلت ہے ایسی حالت میں ایک ذہین اور جفاکش قوم اپنے ذرائع اور وسائل کو کس بے جگری کے ساتھ بر سر کار لاتی ہے ایک ایسا راز ہے جو کسی تفصیل کا محتاج نہیں ہے انسان اپنی عافیت اور راحت کے لئے جب تک صرف مادی قوتوں پر بھروسہ کرے گا یا ان کا متمنی ہوگا اس کی شاخیں روز بروز مُنشقّ ہوتی جائینگی کیونکہ مادی ترقی اکثر وبیشتر مادی طاقت کو بر سرِ کار لاتی ہے اور جب تک مادی قوتوں سے مرافعہ کئے جانے کا امکان ہے اس وقت تک انسانی شکست وریخت لازمی ہے۔

مادّی قوتوں کا بیدار ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ خالق اور مخلوق کے درمیان جو نسبت ہے وہ پامال کی جارہی ہے۔ مادی قوتیں بحیثیت مادّی قوتوں کے روحانی قوتوں سے ممزوج نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے یہ نتیجہ نکالنا قرین قیاس ہے کہ حربیت کا جو مادہ ہے ربط رکھتی ہے صلح وعافیت سے جو ایک ملکۂ اخلاقی ہے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں کسی تفصیل کی اتنی حاجت نہیں ہے جتنا خود یورپ کی ذہنیت اور اُس کے نتائج کا ایک صحیح جائزہ لے لینا۔ یورپ کے اکثر بہترین دل ودماغ آج اس فکر میں ہیں کہ وہ کس نہج

ونوعیت سے دوسری اقوام عالم کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔
ان کو یہ فکر بہت کم دامن گیر ہوتی ہے کہ کس طریقہ سے بنی نوع انسان کو خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہوں اپنے ایثار و قربانی یا ایجاد و اختراع سے فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے اس امتیاز خصوصی کو مدِ نظر رکھ کر اس امر کا ذہن نشین کر لینا یقیناً آسان ہے کہ جو باتیں اس سے پہلے عرض کی گئی تھیں۔
یعنی لامذہبی سرمایہ دار اور مزدور، جوع الارض، عسکریت، سیاسی خداعت نوع ہمدردی اور اخوت کا فقدان سائنس کی محشر زائیاں۔ یہ سب نتیجہ صریح ہیں۔ اسی مادیت اور مادہ پرستی کے اقبالؔ کے ذہن و دماغ پر ایک طرف تو یہ سارے نقوش مُرتسم تھے دوسری طرف مشرق کا نقشہ تھا گویا ایک طرف ہلاکتیں تھیں اور دوسری طرف حسرت اور مایوسیاں۔

لیکن تصویر نامکمل رہ جائے گی اگر اس سلسلہ میں دوسری طرف مشرق کا جائزہ بھی نہ لے لیا جائے۔ دیگر مذاہب کے اعتبار سے اسلام کے نو عمر اور نوخیز ہونے میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک انقلابات کا تعلق ہے اسلام نے اتنے ہی عرصہ میں زندگی اور ہلاکت کے بے شمار مراحل طے کر لئے ہیں۔ چنگیزیوں اور تاتاریوں کے سیلابِ ہلاکت سے اُسے سابقہ پڑا مختلف عقائد اور ملتوں سے یہ ہم آویز ہوا۔ متعدد مختلف حکومتیں دیکھیں، حاکم و محکوم کے مراحل سے بھی گزری سطوت جلالت کا بھی مظہر رہا اور نکبت و محرومی کی تلخیوں سے بھی آشنا ہوا لیکن ہندوستان میں جن حالتوں کے ماتحت اِس کو روزِ بد دیکھنا پڑا وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل جداگانہ تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کا زوال کسی بیرونی حکومت یا طاقت کے استیلا پر نہ تھا۔ ہندوستان کی اسلامی حکومت کی آخری تاریخ آپ کو کسی کتب خانہ میں نہیں مل سکے گی اِس کا سارا دفتر آپ کو ان سینوں میں مِل سکتا ہے جنھوں نے خون کے

آنسوؤں سے تاریخ لکھی ہے اِس کا پتہ الفنسٹن یا لین، پول یا اسمتھ کو نہیں ہے یہ داستانِ درد تو آپ صرف حالی سے سُن سکتے ہیں۔

اسلام دنیا کی ہر طاقت اور ہر آفت کا مقابلہ کر سکتا ہے، لا مسلمانوں کا۔ اسلام ہر کلایو کا مقابلہ کر سکتا ہے مگر کسی میر جعفر پر غالب نہیں آسکتا۔ یہاں ایک اکبر سنگیڑوں اورنگ زیبوں کو زیر و زبر کر سکتا ہے۔ اوہام پرستی، خود غرضی مصلحت اندیشی اور عافیت جوئی ایسی چیزیں تھیں جنھوں نے تقریباً ہر مسلمان کو اسلام کا دشمن بنا دیا ایک ہی اسلام آئینِ اکبری اور فتاویٰ عالمگیری تصنیف نہیں کر سکتا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اُس سبق کو بھلا دیا جس کو اب تک انھوں نے کسی سخت سے سخت ابتلا میں بھی نہیں بھلایا تھا۔ انھوں نے نامساعد حالت اور زمانہ کا مقابلہ نہیں کیا بلکہ خود اسلام کو ان سے ممزوج کرنا چاہا وہ گرد و پیش کے واقعات کو اسلام سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے حالانکہ اسلام دنیا کے سامنے صرف اسلام کی صورت میں پیش کیا جا سکتا تھا یہاں کوئی مفاہمہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ممکن ہے بعض مذاہب۔ لین دین کے اصول پر قائم ہوں یا قائم کئے جائیں، لیکن اسلام یا تو اسلام ہے یا پھر کچھ نہیں۔ مغربی زندگی جس کا ایک دھندلا سا خاکہ اس سے قبل پیش کیا جا چکا ہے اسلام کے منافی ہے۔ مغرب کی نظر صرف حیات پر ہے اسلام حیات کو مہمات کا صرف ایک مرحلہ قرار دیتا ہے۔ مغرب یہ دیکھتا ہے (اور اس کا طلب گار ہے) کہ آب حیات پر موت کو قربان کر سکتے ہیں یا نہیں۔ مسلمان کو اس کی فکر ہے کہ موت پر حیات قربان کرنی ضروری ہے۔ مغرب اس بات کا کوشاں ہے کہ دنیا کی ہر راحت خواہ وہ کسی طور پر حاصل کی گئی ہو کسی طور پر اپنے لئے مخصوص اور محفوظ کی جا سکتی ہے اسلام کو اس کی فکر دامن گیر ہے کہ اپنے اوپر تکلیف اُٹھا کر کسی طرح دوسروں کو راحت پہنچائی جا سکتی ہے۔

یہ ایک نہایت سطحی اور ایک حد تک نامکمل نقشہ تھا۔ اِس اسلام کا جو آج تیرہ سو برس ہوئے ہم پر نازل ہوا تھا اور اس اسلام کا جو ہمارے ہاں تو مسخ ہوا اور جس کے ساتھ ہم خود بھی مسخ ہو گئے۔ ممکن ہے اقبال نے یورپ کا سفر نہایت آرزو اور اشتیاق کے ساتھ کیا ہو۔ ممکن ہے ان کو امید رہی ہو کہ گوہرِ مقصود وہاں ہاتھ لگ جائے گا لیکن میرے نزدیک تو اُن کی حالت

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

کی مصداق رہی اور ان کو بالآخر "سوئے حجاز" "عناں تاب" ہونا پڑا ان حالات کے ماتحت اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی عالمِ وجود میں آئیں اب وقت آگیا ہے کہ ہم اُن کی تعلیمات پر ایک نظر ڈالیں۔

اقبال کا مطالعہ کرنے سے قبل چند ابتدائی رموز ذہن نشین کر لینے چاہئیں کیونکہ یہ ان کی تعلیم کے بنیادی اصول ہیں جن کا مختلف اوقات میں مختلف انداز سے اعادہ کیا گیا ہے۔

۱۔ اقبال کلیتہً اسلامی شاعر ہیں اور ان کی تعلیم کی بنیاد تمام تر دینِ متین کے ارکانِ اساسی پر ہے۔

۲۔ اقبال کے نزدیک حیاتِ انسانی کی اوّلین کامیابی خودی یا انانیت پر ہے یعنی افراد کا اپنی اُس استعداد اور قوت کو محسوس اور مکمل کر لینا اور ان پر بہمہ وجوہ قادر ہونا جس کا اشارہ قرآن پاک میں اِنّي جَاعِلٌ فِي الاَرضِ خَلِيفَة کے الفاظ میں کیا گیا ہے انسانِ مکمل یا "سوپرمین" کا فلسفہ اسی راز میں مضمر ہے۔

۳۔ ایسی مکمل اور جامع ہستیوں کا ایک نظام ملّی۔

۴۔ اقبال کے نزدیک اِس آشوب گاہِ حیات میں اگر کوئی مذہب یا تعلیم یا عمل کامیاب رہ سکتا ہے تو وہ ملّتِ اسلامیہ ہے جو

مجموعہ یا نتیجہ ہے مکمل شخصیتوں اور مکمل نظامِ جمعیت کا۔

یہ ایک سرسری تلخیص ہے اقبال کے اُس پیغام کی جس کو انھوں نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی میں پیش کیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات کو کس طور پر ترتیب دیا ہے اور اپنے اِدّعا کا کیا ثبوت پیش کیا ہے۔

دعویٰ یہ ہے کہ نظامِ عالم کی بنیاد خودی پر ہے اور ہر وجود کا تعیّن اسی نسبت سے ہے۔ جس نسبت سے اس کی خودی کو اِستحکام و استواری ہے ہر چیز کا مدار اور تعین اس چیز کے مستقل وجود سے ہے جس وقت وہ چیز اپنے وجود سے غافل ہوئی اُس پر ایک دوسری حقیقت یا تعیّنِ حقیقت کا اطلاق ہو گیا۔ اس طور پر تعیّنِ وجود استحکام وجود پر منحصر ہے استحکام کا نہ رہنا اس چیز کو تعلق یقین سے محروم کر دیتا ہے اور جب تعین باقی نہ رہا تو وجود کا تخیل معدوم ہو گیا اِس راز کو اقبال نے چند مثالوں سے واضح کیا ہے۔

چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی ست — بس بقدر استواری زندگی ست
کوہ چوں از خود رود دریا شود — شکوہ سنجِ جوششِ دریا شود
موج تا موج مست در آغوشِ بحر — می کُند خود را سوارِ دوشِ بحر
گر بفطرت پختہ تر بودے نگیں — از جراحت ہا بیاسودے نگیں

یہاں تک تو خودی کے کرشمے تھے اب بتانا یہ ہے کہ خودی اپنی حیات اور وجود کے لئے کس کی رہینِ منت ہے۔ اقبال کا فیصلہ یہ ہے کہ

حیات خودی از تخلیق و تولیدِ مقاصد ست

ہر حیات کا مدار ایک دوسری حیات پر ہے یا یوں کہئے تعیّن "حرکت" پر ہے اس طور پر حیات فی نفسہٖ حرکتِ شعوری یا نوعی پر ہے خودی کو پیدا کرنے والی چیز تحریکِ مقاصد ہے اور ہر زندگی کا مدار کسی مقصد پر ہے جسے اقبال نے اِن الفاظ میں ادا کیا ہے۔

زندگانی را بقا از مدعاست | کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است | اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
آرزو ہنگامہ آرائے خودی | موجِ بیتابی ز دریائے خودی
زندہ دانی تمنا مردہ کرد | شعلہ را نقصانِ سوز افسردہ کرد

ہر شے کے وجود کا اطلاق اُس شے کے تعین پر مبنی ہے یعنی جب تک اس شے میں اپنی خودی کو برقرار رکھنے کی آرزو موجود ہے اُس شے کا وجود مُتعین ہے اس طور پر آرزو کا مفہوم احساسِ حیات یا آرزوئے حیات ہوگا۔ اقبالؔ نے خودی کی بنیاد استحکام عشق و محبت پر رکھی ہے اور وجودِ مُسلِم کے لئے جب آرزو (یا عشق و محبت) کو مخصوص کیا ہے وہ ولائے مُصطفویؐ ہے اور یہاں پہنچ کر اقبالؔ نے نفسِ مطلب کی طرف گریز کی ہے۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰ است | آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است
در شبستانِ حرا خلوت گزید | قوم و آئین و حکومت آفرید
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش | تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش
ماند شبہا چشمِ او محروم نوم | تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم
سرِّ مکنونِ دلِ او ما بدیم | نعرہ بے باکانہ زد و افشا شدیم

اقبالؔ نے دستِ سوال کو خودی کا منافی قرار دیا ہے ظاہر ہے جب نفس کو اپنے اوپر اعتماد نہ رہا تو پھر اس میں خود داری کہاں باقی رہی فرماتے ہیں ؎

از سوال آشفتہ اجزائے خودی | بے تجلّی نخلِ سینائے خودی
ہمت از حق خواہ و با گردوں ستیز | آبروئے ملتِ بیضا مریز
فطرت کو بر فلک بندد نظر | پست می گردد ز احسانِ دگر

جس وقت خودی کی عشق و محبت سے تخمیس ہو چکتی ہے نظامِ عالم زیر نگیں آجاتا ہے اس عالم میں پہنچکر انسان ماسوائے بے نیاز اور بے خطر

ہو جاتا ہے یہاں اقبال نے ایک واقعہ نظم کیا ہے۔

حضرت شیخ بو علی قلندر کا ایک مُرید اپنے خیالات میں غرق راستہ سے گزر رہا تھا۔ عامل شہر کی سواری آرہی تھی چوبدار نے راستہ سے علیحدہ ہو جانے کی تنبیہ کی درویش کو خبر نہ ہوئی۔ چوبدار نے ایک ضرب رسید کی۔ مُرید شیخ سے فریادی ہوا۔ شیخ پر جو حالت طاری ہوئی اور اس کا جو انجام ہوا اقبال نے اس کا خاکہ یوں پیش کیا۔

صورتِ برقے کہ بر کہسار ریخت ۔۔۔ شیخ سیلِ آتش از گفتار ریخت
از رگِ جاں آتشے دیگر کشود ۔۔۔ با دبیرِ تے خویش از شانِ نمود
خامہ وا برگیر و فرمانے نویس ۔۔۔ از فقیرے سوئے سلطانے نویس
بندہ ام را عاملت بر سر زدہ است ۔۔۔ بر متاعِ جانِ خود اخگر زدہ است
باز گیر ایں عامل بد گوہرے ۔۔۔ ورنہ بخشم مُلکِ تو با دیگرے
نامۂ آں بندۂ حق دستگاہ ۔۔۔ لرزہا انداخت در اندامِ شاہ
پیکرش سرمایۂ آلام گشت ۔۔۔ زرد مثلِ آفتابِ شام گشت
بہرِ عامل حلقۂ زنجیر جست ۔۔۔ از قلندر عفوِ ایں تقصیر جست

علامہ اقبال نے اس ضمن میں کہ نفیِ خودی اقوامِ مغلوبہ کا شیوہ ہے ایک حکایت لکھی ہے ایک بار گوسفندوں کی چراگاہ میں شیروں کی کچھ تعداد آگئی جس کی وجہ سے سارا مرغزار گوسفندوں کے خون سے رنگین ہو گیا۔ ایک باراں دیدہ گوسفند نے شیروں کا وعظ کہنا شروع کیا جس کا لب لباب یہ ہے کہ ؎

ہر کہ باشد تند و زور آور شقی است ۔۔۔ زندگی مستحکم از نفیِ خودی است
روحِ نیکاں از علف یابد غذا ۔۔۔ تارکُ اللحم ست مقبولِ خدا
جستجوئے عظمت و سطوت شرست ۔۔۔ تنگدستی از امارت خوشترست
برقِ سوزاں در کمینِ دانہ نیست ۔۔۔ دانہ گر خرمن شود فرزانہ نیست

شیروں کو یہ نصیحت پسند آئی انھوں نے گوسفندوں کا دین اختیار کر لیا جس کا انجام یہ ہوا ؎

آں جنونِ کوششِ کامل نماند — آں تقاضائے عمل در دل نماند
اقتدار و عزم و استقلال رفت — اعتبارِ عزت و اقبال رفت
پنجہ ہائے آہنی بے زور شد — مردہ شد دلہا و تنہا گور شد
صد مرض پیدا شد از بے ہمتی — کوتہ دستی بیدلی دوں فطرتی
شیر بیدار از فسونِ میش خفت — انحطاطِ خویش را تہذیب گفت

یہاں تک تو نفسِ خودی سے بحث تھی جس میں ضمناً چند اور مباحث آگئے اب یہ دیکھنا ہے کہ اِس خودی کی تربیت کس طور پر ہوتی ہے اور اقبال کا نظریہ اس کے متعلق کیا ہے۔

اقبال نے تکمیلِ تربیت کے لئے تین مراحل پیش کئے ہیں ایک اطاعت، دوسرے ضبطِ نفس۔ تیسرے نیابتِ الٰہی۔

اطاعت کا مفہوم یہ ہے کہ آئینِ معینہ کی پابندی کی جائے۔ ہر انسان بحیثیت انسان کے چند فرائض کا پابند ہے اور یہ کچھ انسان ہی پر موقوف نہیں ہے۔ ہر شے اپنے وجود کے اعتبار سے چند اوامر و نواہی کی پابند ہے بصورتِ دیگر وہ شے اپنے خصائص سے محروم اور اطلاقِ تعین سے عاری ہے جس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وجود سے بے بہرہ ہے اپنی پابندیوں سے جو بمنزلہ فرائض کے اس پر عائد ہوتے ہیں بوجوہ احسن عہدہ برآ ہونا منشائے فطرت کا پورا کرنا ہے۔

انسان شرفِ انسانیت سے اسی وقت متصف ہو سکتا ہے جب وہ ان تمام پابندیوں سے عہدہ برآ ہو جائے جو اس کی شرفِ انسانیت کے ساتھ لازم قرار دی گئی ہیں جب تک وہ ان کو تمام نہ پہونچائے وہ کلیتہً آزاد نہیں تصور کیا جا سکتا۔ اس لئے تکمیل خودی میں اوّلین فرض یہ لازم

آتا ہے کہ وہ اپنی خلقت اور مقصد خلقت کے اعتبار سے جس آئین کا حامل قرار دیا گیا ہے بلحاظ اوامر اور نواہی اس کی اطاعت کا پابند ہو۔ اطاعت کے مسئلہ میں اقبال نے اونٹ کی مثال پیش کی ہے جس پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جو صفات اس کی خصوصیات میں داخل ہیں بالآخر منزل رساں ثابت ہوتی ہیں ؎

خدمت و محنت شعار اشتر ست
صبر و استقلال کار اشتر ست

گام او در راہ کم غوغا ستے
کارواں را زورق صحرا ستے

نقش پایش قسمت ہر بیشۂ
کم خور و کم خواب و محنت پیشۂ

مست زیر بار محمل می رود
پائے کوہان سوئے منزل می رود

سرخوش از کیفیت رفتار خویشتن
در سفر صابر تر از اسوار خویشتن

ہر کہ تسخیر مہ و پروین کند
خویشتن را زنجیری آئین کند

می زند اختر سوئے منزل قدم
پیش آئینے سر تسلیم خم

نکوہ سنج سختی آئین مشو
از حدود مصطفیٰ بیروں مشو

تعمیر و تکمیلِ خودی میں دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس کا ہے۔ ضبطِ نفس نام ہے اس قدرت کا جو نفس کی ان کمزوریوں یا غلبہ پانیوں پر عبور حاصل کرنے ہیں۔ بہ سرِ کار لانا پڑتا ہے جو تکمیلِ فرائض میں مانع آتی ہیں انسان کا ماسوا سے مرعوب ہونا محض اس بنا پر ہے کہ وہ نفس کی خواہشوں کا پابند ہے فی الحقیقت انسان کسی دنیاوی قوت سے نہیں ڈرتا الا ایسی حالت میں جب اُس کے نفس کی خواہشات معرضِ خطر میں ہوں۔ نظر براں یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ ڈر اپنی خواہشات نفس کے نہ پورے ہونے کا ہوتا ہے اور چونکہ خواہشات اپنے تنوعات کے اعتبار

سے گوناگوں ہوتی ہیں انسان ہر قدم پر خائف اور متزلزل رہتا ہے اور اس کے مسجود کی تعداد ہمیشہ ترقی پر رہتی ہے۔ اگر ڈرنا اور جھجکنا انسان کی فطرت میں داخل ہے تو اس کے ازالہ کی بہترین عملی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ صرف کسی ایک ہستی سے خائف ہو جس کی قدرتِ قہر و مہر کو وہ بہت زیادہ مہیب یا مستحسن تصوّر کرتا ہو۔ اس طور پر وہ چھوٹے چھوٹے خطرات اور اندیشہ ناکیوں سے آزاد ہو جائے گا۔ اس مختصر بحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انسان کو ضبط نفس پر قادر ہونا چاہیئے ورنہ اپنی خواہشات نفس کے اعتبار سے وہ ہمیشہ دوسری شخصیتوں سے مرعوب ہوتا رہے گا اور اس طرح اس کی خودی کی تعمیر یا تکمیل نہ ہو سکے گی۔ اقبال نے اس کا نہایت واضح خاکہ یوں پیش کیا ہے ؎

طرح تعمیرِ تو از گل ریختند　　با محبت خوف را آمیختند
خوفِ دنیا و خوفِ عقبیٰ خوفِ جاں　　خوفِ آلامِ زمین و آسماں
حُبِّ مال و دولت و حُبِّ وطن　　حُبِّ خویش و اقربا و فرزند و زن
تا عصائے لا الٰہ داری بدست　　ہر طلسم خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش　　خم نہ گردد پیشِ باطل گردنش
خوف را در سینۂ او راہ نیست　　خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد　　فارغ از بندِ زن و اولاد شد

اس سلسلہ میں اقبال نے ارکانِ شریعت کے عقلی اور فلسفیانہ نکات پر بھی نظر ڈالی ہے ؎

لا الٰہ باشد صدف گوہر نماز　　قلبِ مسلم را حجِ اصغر نماز
در کفِ مسلم مثالِ خنجر ست　　قاتلِ فحش و بغی و منکر ست
روزہ بر جوع و عطش شب خوں زند　　خیبرِ تن پروری را بشکند
مومناں را فطرتِ افروز ست حج　　ہجرت آموزِ وطن سوز ست حج

حبِ دولت را فنا سازد زکواۃ | ہم ساوات آشنا سازد زکواۃ
دل ز حتیٰ تنفقو المحکم کند | زر فزاید الفت زر کم کند
ایں ہمہ اسباب استحکام تست | پختہ محکم اگر اسلام تست

اطاعت اور ضبطِ نفس کے بعد تعمیر کے مراحل ختم ہو جاتے ہیں اور ان دونوں صفات کا نتیجہ صریح، منزلِ مقصود (نیابتِ الٰہی) پر ختم ہو جاتا ہے نیابتِ الٰہی فی الحقیقت اِنّی جاعِلٌ فِی الاَرضِ خَلِیفہ کی تشکیل و تعمیر ہے۔ یعنی انسان اپنے وجود میں ان تمام صفات کو پیدا یا بالیدہ جو امانت خداوندی سے بہ وجوہ احسن عہدہ بر آ ہونے میں لازم آتے ہوں۔ نیابت الٰہی کا مسئلہ الٰہیاتِ اسلامی میں خاص درجہ رکھتا ہے اس کا راز صرف اس حقیقت میں مُضمر ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اس مسئلہ کا حل عملاً اتنا آسان نہیں ہے جتنا یہ بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ اشرف المخلوقات کا مفہوم یہ ہے کہ انسان صانع حقیقی کے علم قدرت اور حکمت کا اختراع فائقہ ہے اس لئے باعتبار اس نسبت کے جو مصنُوع کو صانع سے ہے یہ ماننا پڑے گا کہ مصنُوع میں صانع کی روحِ صنعت گری پوشیدہ ہے اور یہ روح مصنوع میں جس درجہ کی ہوگی اسی اعتبار سے وہ صانع کے قریب تر ہوگی یا اس میں قریب تر ہونے کی صلاحیت ہوگی۔ اس نظریہ کے ماتحت صانع ازل کا یہ نمونہ صنعت جس کو اشرف المخلوقات تسلیم کیا گیا ہے اپنی استعدادِ قُدرت کے اعتبار سے موجودات عالم پر اتنا ہی قادر اور حاوی ہو سکتا ہے جتنا اس میں استعداد الٰہیہ کے حاصل ہونے کی گنجائش رکھی گئی ہے اور جتنا وہ اس استعداد کو قوانینِ معیّنہ کے ماتحت بالیدہ اور مستحکم کر سکتا ہے نیابت الٰہی اسی حقیقت کی ترجمان ہے جس کی تشکیل اور تفصیل اقبالؔ نے ان الفاظ میں پیش کی ہے ؎

نائبِ حق در جہاں بودن خوش ست
بر عناصر حکمراں بودن خوش ست

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم ست
ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم ست

از رموزِ جزو و کل آگہ بود
دو جہاں قائم بامر اللہ بود

نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر
ہم سپاہی ہم سپہگر ہم امیر

مُدعائے عَلَّمَ الاَسمَا ہستی
سرِّ سُبحَانَ الَّذِی اسرا ستی

ذاتِ او توجیہہ ذاتِ عالم ست
از جلالِ او نجاتِ عالم ست

اِسی نیابت الٰہی کے لئے اقبال کے نزدیک یہ سارا آشوب گاہ حیات چشم براہ ہے اقبال نے اسی "مکمل انسان" کی پذیرائی کی ہے ؎

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو
دو سوادِ دیدہ ہا آباد شو

شورشِ اَقوام را خاموش کن
نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

خیز و قانونِ اَخوت سازدہ
جامِ صہبائے محبّت سازدہ

باز در عالم بیار ایامِ صُلح
کاروانِ زندگی را منزلے

اقبال کا یہی "انسان کامل"[1] ناقدین اور حکمائے یورپ کی طبع آزمائی کا نہایت معرکتہ الآرا موضوع ہے۔ ابھی ناظرین نے غالباً گزشتہ تفصیل کو نظر انداز کیا ہوگا جس میں اقبال اور نیٹشے کے "انسانِ کامل" اور سوپرمین پر اظہار خیال کیا گیا تھا۔

ڈکنس کے اس خیال کی تردید کہ مثنوی زیر بحث میں مادّی قوت کو معبودیت کے درجے پر دکھایا گیا ہے۔ خود اقبال نے کی ہے اور اب تک اقبال کے کلام پر جہاں تک بحث کی جا چکی ہے ناظرین خود اس فیصلے پر پہنچنے کے لئے آمادہ ہوں گے کہ اقبال نے اپنے "انسانِ کامل" میں ایک ایسی زندہ شخصیت کو پیش کیا ہے جو ہمارے مسائلِ معاشرت کو حل کرے ہماری خصومات کا فیصلہ کرے اور بین الاقوامی اخلاق کو ایک محکم تر بنیاد پر قائم کرے، یہاں پہنچ کر یہ سوال بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ جس "مکمل انسان" کا خاکہ اقبال نے پیش کیا ہے وہ (اسلامی نقطۂ نظر سے) آنے والا ہے یا آچکا ہے۔ یہ مسئلہ جتنا معرکتہ الآرا ہے اتنا ہی پیچیدہ اور نازک بھی ہے اسلام کی گذشتہ تاریخ میں اس مکمل انسان کے مسئلہ کو ایسی روشنی میں پیش کر سکتی ہے جہاں شک و شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لیکن جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے اقبال کا "مکمل انسان" اسلام کے اس مکمل انسان سے مختلف ہے بلکہ اس کے علاوہ ہے جس کا ایک مسلمان قائل ہے۔ اقبال کے مکمل انسان کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ جامع جثیات ہو زندگی اور معاشرت کے مختلف اور متعدد شعبوں کے متعلق "مکمل انسان" ہو سکتے ہیں۔ اس محدود معنی میں مصطفےٰ کمال، گوئٹے، مہاتما گاندھی۔ حکیم آئن سٹائن وغیرہ وغیرہ آسکتے ہیں

---

[1] اقبال نے اس موضوع پر آج سے پچیس سال پہلے ۱۹۱۵ء ایک مضمون لکھا تھا جو رسالہ "انڈین انٹی کیری" بمبئی میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کا ماخذ مشہور اسلامی صوفی و فلسفی عبدالکریم الجیلی کی کتاب موسوم بہ "انسان الکامل" تھی۔

یہاں پر میں ایک دلچسپ نکتہ کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں جو میرے ایک سوال پر علامہ سر اقبالؔ نے خود بیان فرمایا تھا یعنی اگر کسی وقت ایک ہی مقام پر دو "مکمل انسان" (سوپر مین) اکھٹے ہو جائیں تو کیا ہو۔ ممدوح نے فرمایا کہ تقدیرِ الٰہی کا منشا یہ ہے کہ دو سوپر مین ایک جا جمع نہ ہو سکیں۔ اگر کبھی ایسا ہوتا ہے تو دونوں غیر مطمئن ہونے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن میں سے ہر ایک اپنی اپنی راہ ہو لیتا ہے۔ مثال میں ممدوح نے جنابِ رسالت مآبؐ اور حضرت اویس قرنیؓ کا واقعہ پیش کیا کہ یہ دونوں ہستیاں باوجود اشتیاق دید یک جا نہ ہو سکیں۔ دوسری مثال نپولین اور گوئٹے کی دی جو ملنے پر بھی ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہ ہو سکے یہاں تک کہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔

یورپ کے بعض ناقدین کا یہ اعتراض ہے۔

"اقبالؔ کہتے ہیں خودی کو خدا میں جذب نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اسے گول کر جاتے ہیں کہ اگر وہ جذب ہونا چاہیئے تو ہو سکتی بھی ہے یا نہیں۔ ہندوؤں کے عقائد کا خوف اُن پر برابر طاری ہے۔

اس بحث پر اس پہلو سے نظر ڈالنی چاہیئے کہ خدا اور خودی میں فرق ہے اور جب تک ان کے وجود کا تعین بحیثیت خدا اور خودی کے لئے ہے دونوں کا انضمام ناممکن ہے اس مسئلہ کی وضاحت یوں بھی ہو سکتی ہے کہ خدا کی ایک صفتِ منزّہ ہونا بھی ہے انسان خواہ وہ مکمل انسان ہی کیوں نہ ہو اپنی حیثیات انسانی سے منزّہ نہیں ہو سکتا۔ ذاتِ باری سے قریب ہونے کی یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ذاتِ باری میں جذب بھی ہو سکتا ہے یا ذاتِ باری میں ضم ہو جانے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ترقی کے راستہ میں ایک مرحلہ ایسا بھی آئے گا جس سے جب تک اس پر انسانیت کا اطلاق ہے وہ آگے نہ بڑھ سکے گا۔ ترقی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ غیر محدود ہو —

اسلامی الٰہیات میں خدا کی ذات وصفات و مختلف چیزیں رکھی گئی ہیں، صوفیائے کرام کے نزدیک یہ عالم اور اس کی موجودات فی حد ذاتہٖ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ یہ محض تعینات و شئونات ہیں اور اسی بنا پر اس کو عالم اعتبار کہا جاتا ہے اور چونکہ ان کی ہستی محض اعراضی ہے اس لئے اُن کو بقا نہیں ہے۔ اس عقیدہ کے ماتحت انسان کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہ جاتی۔ لیکن اقبال کا مسلک کسی حد تک اس سے بالکل جُداگانہ ہے۔ وہ خدا اور انسان دونوں کو مختلف شخصیتیں یا ذات قرار دیتے ہیں اور اس عقیدہ کی رو سے دونوں کا انضمام ناممکن ہو جاتا ہے۔ بہرحال انضمام اس نظریہ کے ماتحت بھی ناممکن ہو جاتا ہے کہ غیر محدود۔ محدود میں کبھی شامل نہیں ہو سکتا۔ اقبال کو ہندوؤں کے عقیدہ کا یوں بھی کبھی خطرہ نہیں ہو سکتا کہ اسلام میں انسانیت اور الوہیت دو مختلف چیزیں ہیں جو جنسِ مختلف ہونے کی حیثیت سے کبھی ایک دوسرے میں جذب نہیں ہو سکیں۔

اقبال کی تعلیم سعی و عمل کی ہے۔ عمل کو انھوں نے انسان کی ساری دقتوں اور زحمتوں کا تنہا علاج بتایا ہے اور یہ تعلیم جتنی مؤثر ہے اُتنی ہی قرینِ قیاس بھی ہے اگر کوئی چیز تکلیف دہ یا وقتِ طلب معلوم ہوتی ہے تو اس کا صرف یہ علاج ہے کہ اس کے ازالہ میں پوری اِستعداد اور قوت کو برسرِ کار لایا جائے۔ فی الاصل کوئی دقت نہیں ہوتی بلکہ یہ ہماری راحت طلبی اور سہل انگاری ہے جو اس کو مشکل بنا دیتی ہے۔ ہر شخص اگر اپنی ضرورت یا وقت کا تجزیہ کرے تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ وقت کا ذمہ دار وہ خود ہے کیونکہ اس کی ضرورت یا دشواری جس اِستعداد قوت و عمل کی مقتضی ہے وہ اس کو کارفرما بنانے سے جی چراتا ہے۔ اقبال نے اس نکتہ کو نہایت دل کش پیرایہ میں ادا کیا ہے ؎

خیز و خلاقِ جہاں تازہ شو — شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
با جہانِ نامساعد ساختن — ہست در میدان سپر انداختن

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
برکند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیب نو ذرّات را
گردشِ ایام را با ہم زند — چرخِ نیلی فام را برہم زند
آزماید صاحبِ قلبِ سلیم — زورِ خود را از مہماتِ عظیم
ممکناتِ قوتِ مردانِ کار — گردد از مشکل پسندی آشکار
زندگانی قوتِ پیداستی — اصل آدم ذوقِ استیلاستی
اے ز آدابِ امانت بے خبر — از دو عالم خویش را بہتر شمر

اسرارِ خودی میں اقبال نے شیخ و برہمن کی ایک حکایت اور گنگا و ہمالہ کا ایک مکالمہ دیا ہے جس میں اس حقیقت کو پیش کیا ہے کہ حیاتِ ملّی کا مدار روایاتِ مخصوصہ ملیہ کی پابندی سے ہے یہ گویا رموزِ بیخودی کی طرف گریز ہے جس میں حیات اجتماعیہ کے اصول و قوانین پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اب تک انفرادی اور شخصی تعمیر و تشکیل پر زور دیا گیا تھا لیکن انفرادی زندگی جماعت سے بھی ایک اہم نسبت رکھتی ہے جس کی بحث نہایت شرح و بسط کے ساتھ رموزِ بیخودی میں کی گئی ہے۔ حکایت مذکورہ بالا میں شیخ نے برہمن کی داستانِ ناکامی سنکر یہ تلقین کی ہے

من نہ گویم از بتاں بیزار شو — کافرے شائستۂ زنار شو
اے امانت دار تہذیبِ کہن — پشتِ پا بر سلکِ آبا مزن
گر ز جمعیت حیات ملت ست — کفر ہم سرمایۂ جمعیت ست

اقبال نے آئین مخصوصہ اور متعلقہ کی پابندی پر ہمیشہ زور دیا ہے اس لئے برہمن کے لئے بھی لازم قرار دیا ہے کہ وہ "تہذیبِ کہن" کے بارِ امانت سے اپنے آپ کو کبھی سبک دوش نہ تصور کرے۔ ہر زندگی کسی نہ کسی اصول یا عقیدہ پر مبنی ہے اس لئے جب تک کسی مخصوص ملّت

پر قائم رہنا منظور ہو اس وقت تک اس کو آئین اور روایات کا پابند ہونا چاہیئے۔

ایک دوسرے مقام پر دریا نے پہاڑ کو طعنہ دیا ہے ؎

حق ترا با آسماں ہمراز ساخت | پات محرومِ خرامِ ناز ساخت
طاقتِ رفتار از پایت ربود | ایں وقار و رفعت و تمکیں چہ سود
زندگانی از خرامِ پیہم ست | برگ و سازِ ہستیِ موج از دم ست

پہاڑ نے اس طنز کا یہ جواب دیا ہے ؎

گفت اے پہنائے تو آئینہ ام | چوں تو صد دریا درونِ سینہ ام
ایں خرامِ ناز سامانِ فناست | ہر کہ از خود رفت شایانِ فناست
از مقامِ خود نہ داری آگہی | بر زبانِ خویش نازی ابلہی
ہستیٔ خود نذرِ قلزم ساختی | پیشِ رہزن نقدِ جاں انداختی
قرنہا بگذشت و من پا در گلم | تو گماں داری کہ دور از منزلم
ہستیم بالید تا گردوں رسید | زیرِ دامانم ثریا آرمید
ہستیٔ تو بے نشاں در قلزم ست | زروۂ من سجدہ گاہِ انجم ست
قطرہ؟ خود را بپائے خود مریز | در تلاطم کوش و با قلزم ستیز

آخر مثنوی میں اقبال نے اس بحث کو چھیڑا ہے کہ ایک مسلم کی حیات اعلائے کلمۃ الحق کے لئے ہے۔ اور ایسا جہاد جس کی بنیاد جوع الارض پر ہو اسلام میں حرام ہے۔ اب تک جن مباحث پر اقبال نے اظہار خیال کیا ہے ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان مباحث کا یک بیک پیشِ نظر ہو جانا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ فی الحقیقت ان مباحث کو اس مقام سے ایک خاص ربط ہے۔

دنیا میں آج کل جو شور و فتن رونما ہے اس کے اسباب پر انہی صفحات میں بحث کی جا چکی ہے۔ اِس کشاکش کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ

انسان حتی الوسع دوسروں کے ثمرات محنت سے فائدہ اٹھانے پر مائل ہی نہیں بلکہ لبا اوقات دلیر بھی ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ انسان اس کی بہت کم جرأت کرتا ہے کہ وہ اپنے یا دوسروں کی جاہ و دولت سے بے پروا یا بے خوف ہو کر حق پر قائم ہو جائے۔ یا اس کا اعلان کر دے حقیقت یہ ہے کہ وہ بالعموم ارتکابِ جرائم پر اپنے آپ کو جتنا دلیر سمجھتا ہے یا اس کو گوارا کرتا ہے اتنا اپنے آپ کو کارِ خیر پر نہ قادر سمجھتا ہے اور نہ اس کی ہمت کرتا ہے۔ جہاد کا وہ مفہوم نہ لینا چاہیئے جسے اغیار نے مسلمانوں کے خلاف شہرت دے رکھا ہے۔ جہاد عبادت ہے انسان کی اس جرأتِ عمل سے جو حق و صداقت کی تحفظ و تعمیم کے لئے اس میں فطرت نے ودیعت کی ہے۔ جس سے وہ عہدہ برآ ہونے سے اکثر گریز کرتا ہے ہر مسلمان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ بقدرِ استطاعت باطل کی تاراجی اور صداقت کی علمبرداری کے لئے اپنی انتہائی قوت صرف کر دے۔ "امر بالمعروف و نہی عنِ المنکر" کا فرمان اسی راز کا ترجمان ہے۔

"اسلام امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے آیا اور امر بالمعروف اور جہاد دونوں ایک ہی حکم کے دو نام ہیں"

پیامِ اقبال

پیامِ اقبال

"پس ہر وہ کوشش جو حق کے لئے ہو۔ ہر وہ صَرفِ مال جو سچائی اور نیکی کی خاطر ہو۔ ہر محنت یا مُشقّت جو صداقت کے نام پر ہو۔ ہر وہ تکلیف و مصیبت جو اپنے جسم و جان پر راہِ حق میں برداشت کی جائے۔ ہر وہ قید خانہ کی زنجیر اور بیڑی جو اعلانِ حق کی وجہ سے پاؤں میں پڑے۔ ہر وہ پھانسی کا تختہ جس پر جمالِ حق و صداقت کا عشق لے جا کر کھڑا کر دے۔ غرض کہ ہر قربانی جو بذریعہ جان و مال اور زبان و قلم۔ سچائی اور حق کی راہ میں کی جائے۔ جہاد فی سبیل اللہ ہے . . . . . .
اور مقام امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں داخل ہے۔"

اسلام ناحق کوشی کا دشمن ہے۔ اس لئے اس کی شریعت میں ہر وہ کوشش حرام ہے جو حقیقت کے راستہ سے دور ہو۔ اقبال کا یہ قول ان کی ساری تفصیل پر آخری لفظ ہے ؎

صلح شر گردد چو مقصود ست خیر — گر خدا باشد غرض جنگ ست خیر
گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند — جنگ باشد قوم را ما آرجمند
ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید — تیغِ او در سینۂ او آرمید

آخر میں اقبال نے تدابیر اور اسباب کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے اور اس بڑی ہستی کو پکارا ہے جس کے اشارہ بغیر یہ ساری داستانِ رستخیز محض بے معنی رہ جاتی ہے اقبال نے ایک ہمنوا، ایک ہمدم اور ایک ہمراز کے لئے

یوں مناجات کی ہے ؎

من مثالِ لالۂ صحرا ستم — در میانِ محفلے تنہا ستم
خواہم از لُطفِ تو یارے ہمدمے — از رموزِ فطرتِ من محرمے
ہمدمے دیوانۂ فرزانۂ — از خیالِ این و آں بیگانۂ
تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش — باز بینم در دلِ او روئے خویش
سازم از مُشتِ گلِ خود پیکرش
ہم صنم اور اشوم ہم آذرش

رَموزِ بیخودی

اسرارِ خودی میں اقبال کو افراد اور شخصیتوں کے متعلق جو کچھ تعلیم دینی تھی یا اس ضمن میں میری عقل وفکر نے جہاں تک میری رہبری کی میں نے ان تعلیمات کا ایک نامکمل سا خاکہ پیش کر دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے ہر چیز ایک نظام کے ماتحت ہوتی ہے۔ ہماری زندگی فی الحقیقت علائق اور نسبتوں کی ایک نامتناہی زنجیر ہے۔ جزو کل کا ربط ناگزیر ہے۔ وہ ہر چیز جسے ہم انسانی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں تعیّناتِ مخصوصہ کا نام ہے اور تعیّن کا وجود تسلسل سے ہے۔ افراد کا جماعت سے تعلق ہوتا ہے۔ جُزو کی بحث ہو چکی ہے۔ اب کل کے ساتھ اس کی نسبتوں پر نظر ڈالنی لازم آتی ہے۔ اقبال نے اس کا اعادہ ان الفاظ میں کیا ہے ؎

فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند — سلک و گوہر کہکشاں و اختر اند
فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
فرد تنہا از مقاصد غافل ست — قوتش آشفتگی را حاصل ست

ملّت کا قیام اختلاط افراد پر ہے اور اس کی تعمیر و تکمیل نبوت سے

ہوتی ہے۔ جماعت کا حقیقی مفہوم نفس نبوت کا ترجمان ہے۔ ہر شے خواہ وہ افراد سے متعلق ہو یا جماعت سے جب تک کوئی زندہ عقیدہ یا قانون اسے مربوط یا مستحکم نہ کرے ربط کا کوئی حقیقی مفہوم پیدا نہیں ہوتا ؎

تا خدا صاحبدلے پیدا کند — کو ز حرفے دفترے املا کند
ساز پردازے کہ از آوازۂ — خاک را بخشد حیاتِ تازۂ
زندہ از یک دم دو صد پیکر کند — محفلے رنگیں ز یک ساغر کند
بندہا از پا کشاید بندہ را — از خداوندان رہاید بندہ را
گویدش تو بندۂ دیگر نۂ — زیں بتانِ بے زباں کمتر نۂ
تا سوئے یک مدعائش میکشد — حلقۂ آئیں بپائش می کند

ایک اسلامی شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال کے نزدیک اس عالم کی حقیقی نجات بالفاظِ دیگر معاشرت کے تمام شعبہ جات کی کامیابی و کامرانی۔ اسلامی اصول کی پابندی اور ان کے نفاذ سے وابستہ ہے شاعری کا براہ راست کام یہ ہے کہ وہ جذبات کو متاثر کرے اور ایک مذہب پرست کا شیوہ مذہبی عقاید کی ترویج و تلقین ہے وہ بھی اس طور پر کہ وہ اپنے کو محض عقائد کی حیثیت سے تسلیم کرائے۔ ان نظریات کو ملحوظ رکھ کر اقبال کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت محسوس ہوتی ہے کہ باوجود شاعر اور مذہب پرست ہونے کے انسانی ذہن و فکر کے میلاناتِ طبعی کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ ارکانِ اسلامی کی صداقت اور ہمہ گیری پر زور دیتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ خود مسلمان ہیں بلکہ محض اس بنا پر کہ انسانی ذہن و فکر کا اسلام سے انحراف کرنا ناممکنات سے ہے اور یہی وجہ ہے کہ اپنے شعر و شاعری میں۔ الفاظ اور ترکیبیں تو ضرور شاعرانہ رکھتے ہیں لیکن بحث و استدلال ایک فاضل حکیم کے انداز سے کرتے ہیں۔ اسلام کے ارکانِ اساسی میں توحید رسالت۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ و حج کو مخصوص حیثیت حاصل ہے آخر الذکر چار

فرائض ایسے ہیں جو عمل سے متعلق ہیں۔ اقبال نے ان کے فلسفہ پر خیالات ظاہر کئے ہیں۔ لیکن پہلے دو حقیقتوں یعنی توحید اور رسالت پر رموزِ بیخودی میں بہایت شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ توحید اور رسالت کا تعلق چونکہ معتقدات سے ہے اور یہیں سے دوسرے شعبہ جات کی ابتدا ہوتی ہے اس لئے اقبال نے ان پر خصوصیت کے ساتھ بحث کی ہے۔ کیونکہ توحید اور رسالت کو دیگر ارکانِ اسلام سے وہی تعلق ہے جو بقیہ دفعات قانونی کو تمہید یا "پری ایمبل" سے ہوتی ہے فرماتے ہیں ؎

اہلِ حق را رمزِ توحید از بر ست — در اتیِ الرحمٰنِ عبداً مضمر ست
دین ازو، حکمت ازو، آئین ازو — زور ازو، قوت ازو، تمکین ازو
اسود از توحید احمر می شود — خویشِ فاروقؓ و ابوذرؓ می شود
ملت از یک رنگیِ دلہاستی — روشن از جلوہ ایں سیناستی
قوم را اندیشہا باید یکے — در ضمیرش مدعا باید یکے
جذبہ باید در سرشتِ او یکے — ہم عیارِ خوب و زشتِ او یکے
گر نباشد سوزِ حق در سازِ فکر — نیست ممکن ایں چنیں اندازِ فکر
مدعائے ما مالِ ما یکے ست — طرز و انداز خیالِ ما یکے ست

توحید ہی وہ حقیقت ہے جو انسان کو ان مکروہات سے محفوظ و مصئون رکھتی ہے جن میں اسیر ہو کر وہ زندگی کو پر آشوب تصور کرنے لگتا ہے۔ مایوس، بزدل یا محزون ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یا تو انسان کو اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے یا پھر وہ کسی حکیم و قادر کا قائل نہیں ہے اور نہ کبھی ظلم گوارا رکھتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے گی کہ خود اعتمادی کا اصلی راز بھی اسی عقیدۂ توحید میں مضمر ہے۔ ہم کو اپنے اوپر اس لئے نہیں اعتماد ہے کہ ہماری قوت و حکومت کے ذرائع و وسائل نا محدود ہیں بلکہ اس کا باعث صرف یہ ہے کہ جہاں سے ہم قوت و قدرت حاصل کرتے ہیں

ایک ایسی ہستی اور حقیقت ہے جو کبھی غلطی یا زیادتی نہیں کرتی۔ اس لئے جب تک ہم اس حقیقت یا ہستی کی پیروی کریں گے ناکامیاب نہیں رہ سکتے اقبال نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ؎

مرگ را ساماں ز قطع آرزو ست ۔۔۔ زندگانی محکم از لَاتَقنطُوا است
اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر ۔۔۔ از نبی تعلیم لَاتَحزَن بگیر
چوں کلیمے سوئے فرعونے رود ۔۔۔ قلبِ او از لَاتَخَف محکم شود
بیم غیر اللہ عمل را دشمن ست ۔۔۔ کاروانِ زندگی را رہزن ست
بیم چوں بند ست اندر پائے ما ۔۔۔ ورنہ صد سیل ست در دریائے ما
ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلب تست ۔۔۔ اصلِ او بیم ست اگر بینی درست
لابہ و مکاری و کین و دروغ ۔۔۔ ایں ہمہ از خوف میگیرد فروغ

ہر کہ رمزِ مصطفٰےؐ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اسلام سے پہلے انسانی ذہن و فکر کو وہ آزادی حاصل نہ تھی جسے آج ہم علم و تہذیب کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ انسان موجوداتِ فطرت کی پرستش کرتا تھا اس لئے وہ کبھی اس پر جری ہی نہ ہو سکا کہ ان کو اپنا تابع اور مسخر بنائے چاند۔ سورج۔ برق و باراں۔ پہاڑ دریا۔ غرض کہ اس قسم کی تمام چیزیں اس کے نزدیک معبود کی حیثیت رکھتی تھیں۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ ان کا کسی طور پر تجزیہ کرتا یا ان پر قدرت حاصل کرنے کی جرءت کرتا۔ اس سے ترقی کر کے انسان نے انسان کی پرستش شروع کی۔ اس کی مختلف صورتیں تھیں کبھی اس نے اپنی ہی نوع کو مذہبی حیثیت سے قادرِ مطلق گردانا اور کبھی کسی جابر قہرمان کے آگے جھکا۔ اس کا ایک نہایت دل نشین خاکہ رموزِ بیخودی میں اقبال نے یوں پیش کیا ہے ؎

بود انساں در جہاں انساں پرست ۔۔۔ ناکس و نابود مند و زیر دست

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش — بندہا در دست و پاؤ گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر — بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحبِ اورنگ و ہم پیرِ کنشت — باج بر کشتِ خراب او نوشت
در کلیسا اسقفِ رضواں فروش — بہر ایں صیدِ زبوں دامے بدوش
برہمن گل از خیابانش ببرد — خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد
از غلامی فطرتِ او دوں شدہ — نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

ایک دوسرے مقام پر اس کا اعادہ یوں کیا ہے ؎

فکرِ انساں بت پرستے بتگرے — ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرحِ آزری انداخت ست — تازہ تر پروردگارے ساخت ست
کاید از خوں ریختن اندر طرب — نام او رنگ ست و ہم خاک و نسب

اگر غور کیا جائے تو اسلام نے سب سے بڑی نعمت جو دنیا کو تفویض کی وہ یہ ہے کہ ہر انسان علم و عمل کے لئے آزاد ہے۔ اس طور پر بقول اقبال اسلام کو ایک وسیع علمی تحریک قرار دینا چاہئے یہ ایک حقیقت تھی جس کو اسلام سے قبل طرح طرح سے مستور رکھا گیا۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لئے اس نے اس حقیقت کو فطری ہی طور پر برافگندہ نقاب بھی کیا۔ اس نے محض ایک مقولہ نہیں پیش کیا۔ بلکہ ساتھ ہی ساتھ نمونہ بھی دنیا کے سامنے لاکھڑا کیا اور وہ بھی اس سہل اور سادہ انداز سے کہ معمولی سے معمولی عقل و تمیز بھی اس سے پوری طور پر آشنا ہو سکی۔ اسلام کے خدا نے اسلام کا محض اپنے کلام و الہام سے اعلان نہیں کیا بلکہ اس کو جناب رسالت مآب ؐ کی ذات میں ثابت بھی کر دیا۔ رسالت مآب ؐ کے وجودِ حیات سے نہ صرف یہ حقیقت واضح ہوئی کہ خدا کیا ہے بلکہ انسان کو کیا کرنا ہے اور جو کچھ کرنا ہے وہ کر بھی سکتا ہے۔ نظر بریں رسالت مآب ؐ کی زندگی کو خدا سے وہی نسبت حاصل ہے جو انسان کو رسالت مآب سے حاصل ہے۔ اس لئے جہاں تک علم و عمل کا

دخل ہے رسالت مآبؐ کی زندگی ہم انسانوں کے لئے خدا کی ذات وصفات سے زیادہ قریب۔ زیادہ قابلِ تقلید اور زیادہ ممکن العمل ہے۔ ممکن ہے اسی عقیدہ کا اظہار اقبال نے ان الفاظ میں کیا ہو۔

معنیِ حرفم کنی تحقیق اگر — بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبی — از خدا محبوب تر گردد نبی

رسالت مآب نے دنیا کے سامنے جو دستور العمل اپنے نمونۂ زندگی سے پیش کیا ہے اس پر غور کرنے سے بہ ظاہر ہوتا ہے کہ "حریت"، "مساوات"، "اخوت بنی نوع انسان کی بنیاد اس کا نمونہ اور اس کا مقصود "رسالتِ محمدیہؐ" تھی۔ عالمِ انسان کی نجات ان ہی ہر سہ حقیقتوں کی تشکیل و تجسیم میں مضمر ہے۔ حریت نے ہر انسان کو انفرادی طور پر آزاد کیا۔ مساوات نے ان سب کو باعتبارِ فطرت ایک سطح پر لا کھڑا کیا اور پھر ان دونوں کو جس نے دنیا کے لئے باعثِ رحمت وعافیت بنایا وہ "اخوتِ بنی نوع انسان" تھی۔ اسلام کے اصطلاحی اور محدود مفہوم سے قطع نظر کر لیا جائے تو اس کے تسلیم کرنے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ان صفات کے اعتبار سے اسلام "زمان ومکان" دونوں کی قید سے آزاد ہے۔ ممکن ہے یہی سبب ہو جس کی بنا پر

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد — بر رسولِؐ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را — او رسل را ختم و ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت — داد ما را آخریں جامے کہ داشت

اقبال کی زبان پر آیا ہو۔

حریت۔ مساوات اور اخوت کی بنا پر قومیت کا جغرافیائی مفہوم بالکل بے معنی ہو جاتا ہے "پین اسلامزم" کا رمز ملک گیری میں نہیں بلکہ "اخوت بنی نوع انسان" میں مضمر ہے۔ ترکوں کا جدید رویہ جس کی بنا پر انھوں نے جمہوریہ ترکی کو "وطنیتِ ترکیہ" پر قائم کیا ہے اس بنا پر صحیح نہیں ہے کہ انھوں

نے اسلام کے مفہوم کو بھی مسخ کر دیا ہے۔ خلافت کا کام یہ نہ تھا کہ اسلام کے دینی اقتدار کو دنیوی طاقت سے برقرار رکھا جائے بلکہ اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ دنیوی اقتدار کو ان پابندیوں سے بے نیاز نہ ہونے دیا جائے جن سے آزاد ہو کر حکومت اور اُس کی نعمتیں محض ایک ہی قوم اور ایک ہی خطہ تک محدود نہیں رہ جاتیں بلکہ دوسری اقوام اور دوسرے ممالک کے لئے موجب آزار ہوتی ہیں۔ حکومتِ ترکیہ نے وطنیتِ ترکیہ کے قائم کرنے میں یوں غلطی کی ہے کہ اس نے نہ صرف اسلام کی ہمہ گیری اور اس کے فیضِ عام کو ترکی تک محدود کر دیا اور شاید یہ بھی متیقن نہیں ہے بلکہ ایک طور پر اس نے دوسرے اقوام کو بھی اسلام کی خوبیوں سے بے خبر رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اسلام صرف مسلمانوں کے لئے نہیں آیا ہے بلکہ یہ دوسرے اقوام اور دوسرے ممالک کے لئے بھی ایک پیامِ عمل و عافیت ہے اسلام صرف اسلامیوں کے لئے نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے لئے ایک عام تبلیغِ عمل ہے جس کو کسی صورت میں محدود نہیں کرنا چاہیئے۔[1] ملّتِ اسلامیہ زمان و مکان دونوں قیود سے آزاد ہے اور یہی سبب ہے کہ اسلام میں نسل و ملک کا کوئی مفہوم نہیں ہے ؎

جوہر ما با مقامے بستہ نیست — بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفالِ جام ماست — رومی و شامی گلِ اندام ماست
قلب ما از ہند و روم و شام نیست — مرز و بوم او بجز اسلام نیست
مسلم استی دل بیاقلیمے مبند — گم مشو اندر جہاں چون و چند
می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم — در دلِ او یاوہ گردد شام و روم

عقدۂ قومیت مسلم کشود — از وطن آقائے ما ہجرت ربود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد — بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد

---

[1] مسلم استی بے نیاز از غیر شو — اہلِ عالم را سراپا خیر شو

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم ست — ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم ست
صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو — یعنی از قیدِ مقام آزاد شو
آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند — بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند — نوعِ انساں را قبائل ساختند
مردمی اندر جہاں افسانہ شد — آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند — آدمیت گم شد و اقوام ماند
تا سیاست مسندِ مذہب گرفت — ایں شجر در گلشنِ مغرب گرفت
قصۂ دینِ مسیحائی فرد — شعلۂ شمعِ کلیسائی فرد

بادہ ہا خوردند و صہبا باقی ست — دوشہا خوں گشت و فردا باقی ست
در سفر یار ست و صحبت قائم ست — خوردہ گیر ست و ملت قائم ست
فرد بر می خیزد از مشتِ گلے — قوم زاید از دلِ صاحبدلے
گرچہ ملت ہم بمیرد مثلِ فرد — از اجل فرماں پذیرد مثلِ فرد
امتِ مسلم ز آیاتِ خداست — اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ ست
از اجل ایں قوم بے پرواستے — استوار از نحنُ نزّلنا ستے
سطوتِ مسلم بخاک و خوں تپید — دید بغداد آنچہ روما ہم ندید
تو مگر از چرخِ کج رفتار پرس — زاں نو آئینِ کہن پندار پرس
آتشِ تاتاریاں گلزار کیست — شعلہ ہائے او گلِ دستار کیست
رومیاں را گرم بازاری نماند — آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست — رونقِ خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند — استخوانِ او تہِ اہرام ماند
در جہاں بانگِ اذاں بود ست و ہست — ملتِ اسلامیاں بود ست و ہست

ملت کی بنیاد اختلاطِ افراد پر ہے لیکن خود ملت کا شیرازہ بندی

کے لئے بھی کسی آئین یا دستور کا وجود لازمی ہے۔ ایک ایسی ملت کے لئے جو تمام عالم کے لئے ابدالآباد تک ایک زندہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہو ضرور ہے کہ اس کا آئین بھی اتنا ہی ہمہ گیر اور لازوال ہو جیسا کہ اس سے پہلے کہیں آ چکا ہے افراد اور ملت دونوں کسی نہ کسی حد تک فنا پذیر ہیں لیکن مقصدِ حقیقی ان اسالیبِ عمل سے بلند و پائندہ تر ہوتا ہے جس کی طرف اقبال نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے ؎

فصلِ گل از نسترن باقی تر است　　از گل و سرو و سمن باقی تر است
کانِ گوہر پروری گوہر گرے　　کم نہ گردد از شکستِ گوہرے

ملتِ اسلامیہ کا آئین قرآن مبین ہے۔ اقبال نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے ؎

نغمہ از ضبطِ صدا پیدا ستی　　ضبط چوں رفت از صدا غوغا ستی
در گلوئے ما نفس موجِ ہواست　　چوں ہوا پابند نے گردد نواست
تو ہمیں دانی کہ آئینِ تو چیست؟　　زیر گردوں سرِ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم　　حکمت او لایزال ست و قدیم
حرف او را ریب نے تبدیل نے　　آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں　　حاملِ او رحمۃٌ للعالمیں
آنکہ دوش کوہ بارش بر نتافت　　سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت
بنگر آں سرمایۂ آمالِ ما　　گنجد اندر سینۂ اطفالِ ما

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اسی سلسلہ میں اقبال نے ایک نہایت نازک لیکن اتنا ہی معرکۃ الآرا مسئلہ بھی پیش کیا ہے جس پر اس زمانہ میں صبر و ایمانداری کے ساتھ غور کرنا اتنا ہی ناممکن معلوم ہوتا ہے جتنا یہ ضروری بھی ہے۔ یعنی انحطاط میں تقلید

جتہاد سے بہتر ہے۔

آج بیرونی اثرات کے سیلاب اور مذہبی ناواقفیت (جس میں علم وعمل دونوں کا نقدان ہے) نے ہر شخص کو اس پر جری کر دیا ہے کہ وہ اسلام کی تعلیم پر نظر ثانی کرے کسی مسئلہ پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالنا قابلِ اعتراض نہیں ہے لیکن جو لوگ آج اجتہاد کے علم بردار کہے جاتے ہیں اُن کے میلانات ذہنی یا اِستعدادِ علم وعمل کا تجزیہ کیا جائے تو حسبِ ذیل قوتیں برسرِکار نظر آئیں گی۔ جن کے موجود ہوتے ہوئے یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ ان نام نہاد اجتہادیوں کا طرزِ عمل صحیح نہیں ہے۔

(۱) عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب ہر حال میں مفید اور قابلِ تقلید ہے اس وقت زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو تہذیب یورپ کو اسلام سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ بعض ایسے مسلمان مصنفین جو یورپین تہذیب اور خیالات سے باخبر کہے جاسکتے ہیں کہتے ہیں جو کچھ اس وقت یورپ میں تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مفید اور بہتر خیال کیا جاتا ہے وہ اسلام کی تاریخ اور تہذیب سے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔ یہ اصول غلط بھی ہے اور خطرناک بھی۔

(۲) اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اسلام کے بعض اصول کو کسی طور پر کمزور یا قابلِ اصلاح سمجھتے ہیں وہ خود اپنے علم وعمل کے اعتبار سے جامع نہیں کہے جاسکتے۔ جب تک اسلام اور مغربی اصول دونوں کا صحیح اور مکمل تجربہ نہ ہو اس وقت تک کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ پیش کرنا صحیح نہ ہوگا۔

(۳) یورپ کو اس وقت ایک حکمراں کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے اس کو وہ سب فطری سہولتیں حاصل ہیں جو اس کے تہذیب و تمدن کو مقبول بنا سکتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں خالص اسلامی شریعت نافذ ہے وہاں اسلامی اصول کو نفاذ کہاں تک مفید یا مکمل ہے اس سلسلہ میں

ہم کو افغانستان کی مثال سامنے رکھنی پڑے گی۔ لیکن اندیشہ ہے کہ بعض حضرات ترکی کی مثال پیش کرنا زیادہ اہم سمجھیں گے۔ اب تک ترکوں یا کمالیوں کا اس بارہ خاص میں جو رویہ رہا ہے اسے ملحوظ رکھتے ہوئے بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ ترکی سلطنت صحیح معنوں میں سلطنت اسلامیہ نہیں ہے بلکہ محض سلطنت یا "وطنیتِ ترکیہ" کی حیثیت رکھتی ہے۔ ترکی نے جو نیا درق پلٹا ہے اس کا کچھ ہی سبب کیوں نہ ہو جن اسباب یا واقعات کے بنا پر اس نے اتنا زبردست انقلاب روا رکھا ہے وہ اسلام یا خلافت کی کوتاہیوں یا زیادتیوں کے سبب سے نہ تھا بلکہ اس کی اصلی وجہ خلفائے عثمانیہ یا دولتِ عثمانیہ تھا۔

(۴) انحطاط کے زمانہ میں قوائے جسمانی و ذہنی دونوں پژمردہ ہو جاتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلاف کے کارنامے اپنی نظروں میں ناقابلِ رسائی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ انسانی فطرت دشوار پسندی اور اولوالعزمی سے فطری طور پر کنارہ کش رہنا چاہتی ہے۔ قوم اور افراد دونوں فاتح کی حیثیت حاصل کرنے کی بجائے فاتحین کی ہم رکابی و ہمنوائی زیادہ پسند کرنے لگتے ہیں۔ اقبال نے اس حالت میں تقلید کو اجتہاد سے بہتر بتایا ہے ؎

عہدِ حاضر فتنہا زیر سراست ‌ ‌ طبع ناپروائے او آفت گرست
بزمِ اقوامِ کہن برہم ازو ‌ ‌ شاخسارِ زندگی بے نم ازو
جلوہ اش ما را ز ما بیگانہ کرد ‌ ‌ ساز ما را از نوا بیگانہ کرد
از دلِ ما آتشِ دیرینہ برد ‌ ‌ نور و نار لا الٰہ از سینہ برد
اجتہاد اندر زمانِ انحطاط ‌ ‌ قوم را برہم ہمی پیچد بساط
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر ‌ ‌ اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

جس طور پر ہر عمل کا کوئی خاص مقصد ہوتا ہے خواہ یہ انفرادی ہو یا اجتماعی

اسی طور پر ملتِ اسلامیہ محمدیؐ کا ایک نصب العین ہے اور وہ "حفظ ونشر توحید" ہے۔ افراد کو جو قوت جماعت کی شکل میں نمودار کرتی ہے وہ کسی مخصوص مقصد کی تبلیغ یا تشکیل ہے اگر ایسا نہ ہو تو افراد اور جماعت کبھی ایک دوسرے سے وابستہ نہ ہو سکیں اس لئے "جمعیت" کا مدار کسی مخصوص نصب العین کی تعمیر و ترمیم پر ہے لیکن "حقیقی جمعیت" اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب نصب العین بھی ہر طور پر ممکن و مستحسن ہو۔ اس عالمِ حیات کا اصل راز تبلیغِ توحید میں مضمر ہے اور چونکہ اسلام کو دینِ فطرت ہونے کا دعویٰ ہے اس لئے مقصد بھی اتنا ہی عالمگیر اور مقدس ہے ؎

ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل — کیف و کم از وے پذیرد ہر عمل
گردشِ خونے کہ در رگہائے ماست — تیز از سعیِ حصولِ مدعاست
صد نیستاں کاشت تا یک نالہ رست — صد چمن خوں کرد تا یک لالہ رست
نالہ ہا درکشتِ جاں کاریدہ است — تا نوائے یک اذاں بالیدہ است
نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ — انتہائے کارِ عالم لا الٰہ
زانکہ در تکبیر رازِ بود تست — حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصود تست
جلوۂ در تاریکیِ ایام کن — آنچہ بر تو کامل آمد عام کن
لرزم از شرمِ تو چوں روزِ شمار — پرسدت آں آبروئے روزگار

حرفِ حق از حضرتِ ما بردۂ
پس چرا با دیگراں نسپردۂ

حیاتِ انسانی کے تمام افعال و مشاغل باعتبار تعینات ہمیشہ متشکل ہوتے رہتے ہیں اور یہ محض اس لئے کہ مزید سعی و کوشش کے لئے ایک نمونہ سامنے ہو اور یہ معلوم ہوتا رہے کہ ہر سعی و حرکت کس طور پر اور کہاں تک بار آور ہوئے اور جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے کیا وہ اس پایہ کی ہے کہ اس کے لئے مزید کوشش کی جائے یا اس کے قائم رکھنے میں مزید تگ و دو روا رکھی جائے

گویا ہر مزید کوشش ابتدائی کوشش کے لئے ایک سند جواز ہے۔ اس طور پر گویا زندگی کی یہ سعی پیہم ایک مقصد و مرکز کے لئے ہے۔ حیاتِ ملیہ کے لئے ضروری تھا کہ کوئی "مرکزِ محسوس"، ملتِ اسلامیہ کا مرکز "بیت الحرام" ہے۔ اقبالؔ نے اس تفصیل و تخصیص کی طرف یوں اشارہ کیا ہے ؎

در گرہ چوں دانہ دارد برگ و بر — چشم برخود وا کند گردد شجر
خلقے از آب و گلِ پیدا کند — دست و پاؤ چشم و دل پیدا کند

ہمچناں آئینِ میلادِ امم — زندگی بر مرکزے آید بہم
حلقہ را مرکز چو جاں در پیکرست — خطّ او در نقطۂ او مضمرست
قوم را ربط و نظام از مرکزے — روزگارش را دوام از مرکزے
را زدار دار ما بیت الحرام — سوز ما ہم سازِ ما بیت الحرام
دعوے اور ادلیل استیم ما — از براہینِ خلیل استیم ما
در جہاں ما را بلند آوازہ کرد — با حدوثِ ما قدم شیرازہ کرد
تو ز بیو بندِ حریمے زندۂ — تا طوافِ او کنی پائندہ
در جہاں جانِ امم جمعیت ست — در نگر سرِّ حرم جمعیت ست
عبرتے اے مسلمِ روشن ضمیر — از مآلِ امت موسیٰ بگیر
داد چوں آں قوم مرکز را ز دست — رشتۂ جمعیت ملت شکست

آج یورپ کی جو چیز ہم کو سب سے زیادہ قابلِ رشک معلوم ہوتی ہے وہ اس کے فرزندوں کی "تسخیر قوائے نظامِ عالم" ہے اس میں شک نہیں جہاں تک قوائے نظام عالم کو مسخر کرنے کا تعلق ہے یورپ کی ترقی ہر نوع مہتم بالشان ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو حقیقت سے آشنا ہیں یا آشنا ہونا پسند کرتے ہیں کہ جو ترقیاں علم و عمل کی آج نظر آرہی ہیں ان کی آج سے بہت پہلے مسلمانوں نے یورپ میں ابتدا کی تھی۔ یورپ کو جو برکات مسلمانوں سے

حاصل ہوئیں ان کے شمار کرانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس کا اعتراف خود اہلِ یورپ کر چکے ہیں۔ مسلمانانِ اکثر اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ وہ عام عالمِ اسلام پر اس وقت جو انحطاط رونما پاتے ہیں۔ وہ اسلام کے اساسی تعلیمات کے سبب سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا باعث مسلمان خود ہے۔ مسلمانوں سے پہلے یہ تعلیم کسی مذہب نے نہیں دی ہے کہ یہ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، دریائیں، آلبشار، برق و باد پرستش کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ انسان کے تابع کئے گئے ہیں۔ اور وہ اس کے ذہن و فکر اور قوتِ عمل کی مختلف وسیع جولانگاہیں ہیں۔ اسلام تو ایک شریعت عمل تھا۔ ہم نے اس کو یا تو متکلمین و معتزلہ کی ورزشِ دماغی سمجھ لیا یا پھر جاہل مولویوں یا واعظوں کا وسیلۂ رزقِ قوائے عالم کی تسخیر ڈرائنگ روم کی لطیف معصیتوں یا تکفیر کے فتووں سے نہیں کی جا سکتی اس کے لئے ضرورت تھی محنت اور قربانی کی جس سے ہم آج بھی بہت دور ہیں۔ ہم تو دوسروں کے ثمرۂ محنت سے مستفید ہونا ہی اپنا ایک بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ ہماری بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم اسلام کی تعلیم کو محض راہِ نجات یا بہشتی زیور کی تعلیم سمجھنے لگے ہیں۔ حالانکہ قرآن پاک ایک زندہ جاوید پیغام عمل ہے۔ جس سے منحرف رہ کر مسلمان ہی نہیں کوئی قوم دنیا میں زندہ یا کامیاب نہیں رہ سکتی۔ حیاتِ ملیہ اسلامیہ کا مقصد اسرارِ حیات کو اس طور پر براگندہ نقاب کرتا ہے کہ دنیا میں امن و کامرانی کے امکانات وسیع ہوتے رہیں۔ اس لئے حیاتِ ملی کے لئے لازم ہے کہ اس کا مقصد عین تسخیر قوائے نظام عالم ہو۔ اقبال نے اس کی تبلیغ یوں کی ہے ؎

اے کہ بانا دیدہ پیماں بستۂ — ہمچو سیل از قید ساحل رستۂ
چوں نہال از خاک ایں گلزار خیز — دل بغائب بند و از حاضر ستیز
ماسوا از بہر تسخیر ست و بس — سینۂ او عرصۂ نیرست و بس
ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد — عالمے از ذرّۂ تسخیر کرد

کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بر — تختۂ تعلیم اربابِ نظر
نائبِ حق در جہاں آدم شود — بر عناصر حکمِ او محکم شود
آنکہ بر اشیا کمند انداخت است — مرکب از برق و حرارت ساخت است
علمِ اسما اعتبارِ آدم ست — حکمتِ اشیا حصارِ آدم ست

افراد کے سلسلے میں خودی کی بحث انہیں صفحات پر کہیں آچکی ہے۔ اس لئے اس کا تذکرہ تحصیلِ حاصل ہوگا۔ جس طور پر افراد کے لئے "احساسِ خودی" لازمی ہے۔ جہاں تک ان اصول و عقائد کا تعلق ہے جن کے حفظ تعمیم و تشکیل کا وسیلہ ملّتِ اسلامیہ ہے یہ بحث اس سے پہلے آچکی ہے کہ ہماری حیات کا مقصد اور اس کا دار و مدار لا الٰہ پر ہے لیکن امّت کو جو نسبت رسول ؐ سے حاصل ہے وہ کئی حیثیت سے اس نسبت سے زیادہ قوی ہے جو ہم کو خدا سے حاصل ہے۔ اس نظریہ سے ممکن ہے بعض بزرگوں کو غلط فہمی یا آزردگی پیدا ہو۔ لیکن اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ مسئلہ کچھ بہت زیادہ سنگین نازک نہیں رہ جاتا کہ باوجود اس کے کہ ؎

شرطِ اسلام بود ورزشِ ایمان بالغیب

اپنی جگہ پر بالکل درست ہے لیکن خدا نے بعثتِ نبوی میں سب سے بڑا راز یہ رکھا ہے کہ وہ جو کچھ ہم بندوں سے کرانا چاہتا ہے۔ اس کا ہم بندوں ہی میں سے نمونہ بھی پیش کر دیتا ہے تاکہ ہم اس کو اپنے لئے محض ایک آسمانی کرشمہ نہ سمجھیں جو بندوں کی فہم و ادراک یا اس کے سعیِ عمل سے بالا ہو۔ بلکہ ایک ممکن العمل حقیقت تصور کریں۔ ٹھیک اسی طور پر ملّت کی ترقی و بقا کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم محض عقائدِ مجردہ کی علم برداری کرتے رہیں بلکہ ان روایات کا احترام کریں اور اس کو برقرار رکھیں جو ہمارے برگزیدہ اسلاف نے اپنے عمل سے ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔ اقبالؔ نے اس کی تفصیل و توضیح ایک نوزائیدہ بچہ سے کی ہے جو ابتداءً ہر شے سے ناآشنا ہوتا ہے اور جس کا ؎

بستہ با امروز او فرداش نیست — حلقہ ہائے روز و شب در پاش نیست
چشم ہستی را مثال مردم ست — غیر را بینندہ و از خود گم ست

رفتہ رفتہ : ؎

صد گرہ از رشتۂ خود وا کند — تا سر تارِ خودی پیدا کند
گرم چوں افتد بکارِ روزگار — ایں شعورِ تازہ گردد پائدار
نقشہا بردارد و اندازد دار — سرگذشتِ خویش را می سازد دار

اسی طور پر ؎

قوم روشن از سوادِ سرگزشت — خود شناس آمد ز یادِ سرگزشت
سرگزشتِ او گر از یادش رود — باز اندر نیستی گم می شود
چشم پُر کارے کہ بیند رفتہ را — پیشِ تو باز آفریند رفتہ را
ضبط کن تاریخ را پایندہ شو — از نفسہائے رمیدہ زندہ شو
سر زندہ از ماضی تو حال تو — خیزد و از حالِ تو استقبال تو
مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال — رشتۂ ماضی ز استقبال و حال

موجِ ادراکِ تسلسل زندگی ست
مئے کشاں را شورِ قلقل زندگی ست

موجودہ زمانے میں ہر حقیقت کی سند جواز یا عدم جواز یورپ سے حاصل کی جاتی ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے۔ کہ یورپ کے اصول یا اس کے فیصلے نقائص یا غلطیوں سے مبّرا ہوتے ہیں۔ بلکہ آج وہ فاتح کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنے حواریین کو ممتاز اور مخالفین کو سرنگوں کرنے کے قابل ہے۔ ہم آج یہ نہیں دیکھتے کہ ہم میں کیا خوبیاں ہیں۔ بلکہ یورپ کے بعض صریح نقائص کو بھی چاہتے ہیں کسی طور پر مستحسن ثابت کر سکیں قطع نظر دیگر مسائل کے جن کو معرضِ بحث میں لانا طوالت سے خالی نہیں ہے۔ ایک مسئلہ خواتین کی تعلیم حقوق اور آزادی کا ہے یہاں اس سے بحث نہیں کہ یورپ نے عورتوں کو کیا سمجھ

یا بنا رکھا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کا جو درجہ مقرر کیا ہے۔ وہ ہماری نظروں میں کیا وقعت رکھتا ہے۔ تعدادِ ازدواج، پردہ اور اس قسم کی اور چیزیں ہم روشن خیالوں کے لئے نہایت روح فرسا ہیں اور مغرب کے لئے جب ''حلف وفاداری'' اٹھاتے ہیں تو سب سے پہلے ہماری نظر عورت ہی پر پڑتی ہے۔ اس کے بعد کوئی تعجب نہیں کہ اگر مذہب بھی زد میں آجائے نام نہاد روشن خیال طبقہ کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے یا ان کی میلانات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت روشن ہو جائے گی۔ ان میں سے ہر ایک کی نظر صرف دو نقائص پر پڑتی ہے ایک مذہب دوسری عورت۔ لیکن لطف عبرت، با تعجب یہ ہے کہ یہی دو چیزیں ہیں جو مشرق بالخصوص اسلام نے عورت (بالفاظ دیگر امومت) کو کیا درجہ دیا ہے۔ اقبال کے حسب ذیل خیالات سے ظاہر ہوگا ؎

پوششِ عریانیِ مردان زن ست	حسنِ دل جوعشق را پیراہن ست
آنکہ نازد بر وجودش کائنات	ذکر او فرمود با طیب و صلوٰۃ
ملت از تکریمِ ارحام ست و بس	ورنہ کارِ زندگی خام ست و بس
بردمد این لالہ زارِ ممکنات	از خیابانِ ربا طِ امہات
حافظِ رمزِ اخوت مادراں	قوتِ قرآن و ملت مادراں

اقبال نے نسار اسلام کے لئے سیدۃ النساء کو ''اسوہ کاملہ'' قرار دیا ہے ؎

نورِ چشمِ رحمۃ للعالمین	آں امامِ اولین و آخرین
بانوے آں تاجدارِ ھل اتیٰ	مرتضیٰ مشکل کشا شیرِ خدا
مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق	مادرِ آں کارواں سالارِ عشق
مزرعِ تسلیم را حاصل بتول	مادراں را اسوۂ کامل بتول
آں ادب پروردۂ صبر و رضا	آسیا گرداں ولب قرآں سرا

مثنوی کے اس حصے کو اقبال نے انتہائے جوشِ عقیدت سے لکھا ہے جس کے ایک ایک حرف سے والہانہ شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے۔ موجودہ

زمانہ میں تہذیب وشائستگی کے نام سے اِس ہیکلِ ناموس وعفت کے ساتھ جیسا کچھ سلوک روا رکھا جارہا ہے اقبال نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

؎ اے ردایت پردۂ ناموسِ ما — تاب تو سرمایۂ فانوسِ ما
اے امینِ نعمت آئینِ حق — در نفسہائے تو سوزِ دینِ حق
دورِ حاضر تر فروش و پرفن ست — کارِ دانش نقدِ دیں را رہزن ست
کور و یزداں ناشناس ادراکِ او — ناکساں زنجیریٔ پیچاکِ او
چشمِ او بیباک و ناپرواستے — پنجۂ مژگانِ او گیراستے
ہوشیار از دست بردِ روزگار — گیر فرزندانِ خود را فتادہ اند
فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند — چشمِ ہوش از اسوۂ زہرا مبند

تا حسینے شاخِ تو بر آورد
موسمِ پیشیں بہ گلزار آورد

خاتمہ مثنوی پر اقبال نے سورہ اخلاص (قل ھو اللہ) کی تفسیر دی ہے اور اسے "خلاصہ مطالب مثنوی" قرار دیا ہے "ھو اللہ احد" کا پیغام حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے زبان مبارک سے یوں دیا ہے ؎

آں کہ نامِ تو مسلماں کردہ است — از دوئی سوے یکی آوردہ است
خویشتن را ترک و افغاں خواندۂ — وائے برتو آنچہ بودی ماندۂ
صد ملل از ملتے انگیختی — بر حصارِ خویش شبخون ریختی
یک شو و توحید را مشہود کن — غائبش را از عمل موجود کن

اسی طور پر دیگر آیات شریفہ کی ترجمانی کی ہے ؎

گر بہ اللہ الصمد دل بستۂ — از حدِ اسباب بیروں جستۂ
بندۂ حق بندۂ اسباب نیست — زندگانی گردشِ دولاب نیست
راہ دشوار است ساماں کم بگیر — در جہاں آزادی آزاد میر
خود بخود گردد درِ میخانہ باز — بر تہی پیمانگانِ بے نیاز

فارغ از آب وام و اعمام باش — ہمچو سلماں زادہ اسلام باش

گر نسب را جزوِ ملت کردهٔ — رخنه در کارِ اخوت کردهٔ
رشتهٔ مایک تولائش بس است — چشم ما را کیفِ صہبائش بس است
ہر کہ پا در بندِ اقلیم وجد است — بے خبر از "لم یلد لم یولد" است

رشتہ با لم یکن باید قوی — تا تو در اقوام بے ہمتا شوی
آن کہ ذاتش واحد است و لاشریک — بندہ اش ہم در نسازد با شریک
مومنِ بالائے ہر بالاترے — غیرتِ او بر نتابد ہمسرے
خوار از مہجوریِ قرآں شدی — شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

آخر میں اقبال نے "رحمۃ للعالمین" کے حضور میں "عرضِ حال" کیا ہے ؎

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی — جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
در جہاں شمعِ حیات افروختی — بندگاں را خواجگی آموختی

مسلم از سرِّ نبی بیگانہ شد — باز ایں بیت الحرم بتخانہ شد
از منات و لات و عزیٰ و ہبل — ہر یکے دارد بتے اندر بغل

اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است — یک دعایت مزدِ گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل — عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
ہست شانِ رحمتت گیتی نواز — آرزو دارم کہ میرم در حجاز
تا بیاساید دلِ بے تابِ من — بستگی پیدا کند سیمابِ من

با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغاز انجامم نگر

یوم اقبال

اُردُو شاعری کی تاریخ کا یہ پہلو آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ اُردو شاعری ہمارے گُفتنی و ناگُفتنی حالات کی جس حد تک ترجمان رہی اس حد تک ان حالات کو بہتر و برتر بنانے میں مُعین نہ ہوئی۔ ہمارے شعر و ادب میں علی گڈھ تحریک یا حالی کے عہد سے پہلے ذہنی تجربوں یا تہلکوں کے نشان نہ ملنے کے برابر ملتے ہیں ہمارے شعراء شاعری میں عبادت تو خوب خوب کرتے تھے حسنِ عمل سے کوئی علاقہ نہ رکھتے تھے۔ وہ مشکل سے مشکل بحر، قافیہ اور ردیف میں حلیہ سے حلیہ سر غزلہ، چہار غزلہ تیار کر لیتے تھے۔ لیکن زندگی اور زمانے کے مطالبے کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ ان کے ہاں "شکست" کی آواز ملتی ہے دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان نہیں ملتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ان شعراء پر زندگی و زمانہ کی چوٹوں کا اثر نہ ہوتا تھا البتہ وہ ان چوٹوں کو ابنائے جنس کی چوٹ سمجھنے سے قاصر تھے۔ بعض دوستوں نے ان کی متفرق نظموں یا غزلوں میں زندگی اور زمانہ کا کرب یا دھڑکن دریافت کی ہے لیکن میں اس نظریہ کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں۔ حُسنِ ظن سے ہم نے جہاں اور بہت سے معرکے سر کئے ہیں یہ ایک تھی! اُردو شاعری میں ہمارے بیشتر شعرا نے تفریح یا تضرع سے اور کام لیا ہے۔ شاید ہی کسی اور ملک یا ادب میں شاعری کی یہ گت بنی ہو۔ محض چند ایک، سے قطعِ نظر بقیہ نے زندگی کا غم غلط کرنے کی خاطر شاعری کی پناہ پکڑی۔ زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لئے شاعری نہیں کی۔

صاحبو! میں اتنا ماننے کے لئے تیار ہوں کہ ہمارے ہاں کچھ شعراء ایسے گذرے ہیں۔ جنہوں نے ہمارے ذہنی رجحانات کو بعض نازک مواقع پر اچھے راستہ

لگایا ہے۔ اس کی پہلی مثال انیس کے ہاں ملتی ہے۔ لکھنؤ میں اُردو شاعری کا جو رنگ و آہنگ تھا اُس کو مُنقلب کر دینے کا سہرا انیس اور انیس کے خاندان کے سر ہے انھوں نے قوم کے مزاج کو پہچان کے شاعری کا رخ بدلا لیکن اپنے زمانہ کے ڈھنگ کو نہ بدل سکے۔ شعر و ادب کو گرانمایہ کیا۔ مذہبی شاعری میں محسن کاکوروی کا نام بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ محسن کے اس کمال کا اعتراف کم لوگوں نے کیا ہے کہ وہ لکھنؤ کے تنہا شاعر ہیں جنہوں نے لکھنوی شاعری کے کمزور پہلو کو اپنے نعتیہ کلام سے دلکش بنا دیا۔ دیا شنکر نسیم اُن سے پہلے گذرے ہیں جن کی "گلزار نسیم" کی بے ساختہ صنّاعی کی نظیر ہماری شاعری میں نہیں ملتی۔ لیکن جس پل صراط پر محسن کو چلنا پڑا نسیم اس سے بالکل محفوظ رہے۔ انیس اور انیس کے کلام نے ہمارے ادبی مزاج کو سُدھارا اور سنوارا۔ بالخصوص اس وقت جب ہمارے ہاں سوءِ مزاج کے سوا کچھ اور نہیں رہ گیا تھا۔

انیس کے بعد حالی نے اردو شعر و ادب کے دھارے کو موڑا اور اس کو ایسی وادیوں سے گذرنے کا موقع دیا جہاں نہ صرف اس دھارے کی حیات بخشی میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی رَد اور روانی میں زور آیا۔ حالی سے پہلے شعرا تلخیٔ کام و ذہن کی آزمائش میں بطور کارِ خیر شریک ہو جایا کرتے تھے۔ حالی زہرِ غم قلب و جگر میں اتار چکے تھے۔ ان کا رنج و الم شخصی یا رسمی نہ تھا۔ ان کے ماتم سے انسانیت ماتم گسار نظر آنے لگتی تھی۔ حالی کے ماتم میں حرکی و تخلیقی استعداد پائی جاتی ہے۔ حالی نے غالباً سب سے پہلے اس حقیقت کو پیش کیا کہ خلوص و دردمندی، علم، آرٹ اور انسان سب کی معراج ہے۔ شاعری میں حالی نے سچائی کو آزمائش و زیبائش پر ترجیح دی۔ حالی کا لہجہ دھیما ہے لیکن اسی میں یہ قابلیت ہے کہ وہ شور و سکوت دونوں میں یکساں سنائی دیتا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حالی کی شاعری نے مسلمانوں میں اضمحلال و افسردگی پیدا کر دی۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ حالی کی مثال اُس شخص کی ہے جو سردار کی

بے گور و کفن نعش پر مجہول بین ڈ یکا نہیں کرتا بلکہ ایک خطبۂ میت دے رہا ہے جس سے تھکی ہاری سپاہ اور ساتھیوں کا عزم نئے سرے سے بیدار ہوتا ہے۔ مسدّس سے قطع نظر حالیؔ کی شکوہ ہندی میں بصیرت رکھنے والوں کو وہ چیز نظر آئے گی جو مسلمانوں سے نہیں انسانیت سے اوجھل ہوگئی تھی۔ حالیؔ نے مسلمانوں کے زوال کو انسانوں کا زوال سنوایا ہے۔ حالیؔ نے مسلمانوں کے جن فضائل کے زوال کا ماتم جس خلوص اور سطوتِ حزیں سے کیا ہے اس نے شکوۂ ہند کو دنیائے ادب کی عظیم المرثیت المیہ کے بہت قریب کر دیا ہے۔

حالیؔ اور اکبر کا زمانہ ایک ہے لیکن دونوں کی شاعری کے حدود مختلف ہیں حالیؔ کے مدِ نظر اسلام اور مسلمان ہیں۔ اکبر مشرق اور مشرقیت کے نمائندہ ہیں وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو مغربیت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہتے دیکھتے ہیں اور اپنی جیسی کر گذرتے ہیں۔ اکبر پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اُن کو مغرب میں کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی۔ وہ مغرب سے ناواقف تھے۔ وہ مغرب کی سطحی باتوں کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ قدیم کو ہر اعتبار سے مقدس و محترم گردانتے تھے۔ وہ عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے اور انگریزی تعلیم بھی پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن اکبر جس زمانہ میں تھے اس میں ہمارے بڑے سے بڑے صاحبِ فکر و نظر یورپ کی اس نصیحت مرعوب تھے جو اکبر کو نظر آتی تھی اس زمانہ کی مقتدر تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ اور تو اور ہم اپنے مذہب کو بھی اسی حد تک برحق یا قابلِ اعتبار سمجھتے تھے جس حد تک اس کی سند جواز مغرب کے اعمال و افکار میں ملتی تھی۔ اس زمانے میں بھی اکبر مغرب سے مرعوب نہ ہوئے تو کسی نہ کسی حد تک ان کی بڑائی تسلیم کرنی پڑے گی۔ پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ لوگ جو مغرب سے پورے طور پر آشنا ہیں ان میں کتنے ایسے ہیں جو آج بھی اسی دیارِ اکبر میں یورپ کی بڑائی ہر شعبہ حیات میں تسلیم کرتے ہیں۔

اکبر کی مصطلحاتِ شاعری ذرا برجن قسم کی ہیں۔ ان کے بدھوان تنقیدی برہمنوں کو نہیں بھاتے۔ اکبر سیدھی بات بہت جلد بغیر کسی ہیر پھیر کے کہہ دیتے ہیں۔ اس سے شعروادب "اشراف وثقات" گھبراتے ہیں۔ یہ رویہ یا نقطۂ نظر تنقید کی شریعت میں جائز نہیں رکھا گیا ہے۔ پھر ہر شاعر کو اختیار ہے چاہے وہ کل سے جزو کا استنباط کرے چاہے جزو سے کل کا۔ اکبر ہی نہیں کوئی بڑا شخص یا شاعر "کولیشن منسٹری" نہیں بنا سکتا۔ اس کے ہاں مفاہمت نہیں ہوتی یعنی "یہ بھی درست اور وہ بھی درست — درست نہیں"۔ شاعر کا یہ ٹیکنک نہیں ہوتا یہ کام ہمارا، آپ کا ہے کہ ہم شاعر کو جریب اور ترازو سے ناپنے کے بجائے اس کو سمجھنے اور جانچنے کے لئے ذوق و ذہانت سے کام لیں۔

حالی کے زمانہ میں ہونے کے باوجود نفسیاتی ترقی کے اعتبار سے اکبر ایک طور پر حالی سے آگے ہیں۔ سودا کی ہجویات سے قطع نظر اکبر ہماری شاعری میں پہلے شاعر ہیں جنھوں ہنسنے ہنسانے میں پہل کی ہے۔ یہ کام حالی کے عہد میں کسی اور کے بس کا نہ تھا۔

صاحبو! میری یہ گفتگو اب تک آپ کو غیر متعلق معلوم ہوئی ہوگی۔ لیکن اقبال کا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے ان مقامات سے گذرنا ضروری تھا۔ گو میں اس کا بھی قائل ہوں کہ اقبال اب اس درجہ پر فائز ہیں۔ جہاں یہ حکم لگانا بے محل نہ ہوگا کہ جو اقبال کا معتقد نہیں وہ خود بھی بے بہرہ ہے کوئی شاعر یا آرٹسٹ وسیع اور حقیقی معنوں میں شاعر یا آرٹسٹ نہیں ہے اگر وہ سارے جہاں کا شاعر یا آرٹسٹ نہ ہو۔ آپ اور میں اقبال کو مسلمان شاعر مانتے ہیں اور غلط نہیں مانتے اور نہ ایسا سمجھنا اقبال ہی نہیں کسی بڑے شاعر کی شان کے منافی ہے۔ اقبال کو میں انہیں معنوں میں مسلمان شاعر مانتا ہوں جن معنوں میں اسلام کو سارے جہاں کا مذہب سمجھتا ہوں۔ اگر رحمتہُ اللعالمین سارے جہان کے لئے باعثِ رحمت ہیں تو ان کا نام لیوا

خواہ وہ شاعر ہو یا لیڈر سارے جہاں کے لئے شاعر اور لیڈر رہوگا۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ ہم میں آپ میں جو لوگ اقبال سے ناواقف ہیں یا اقبال کے قائل نہیں ہیں وہ نہ صرف غیر تعلیم یافتہ ہیں بلکہ غیر متمدن بھی ہیں۔ وہ شخص یقیناً تعلیم یافتہ یا متمدن نہیں کہا جا سکتا جو آفاق گیر شعرا یا آرٹسٹ کی عظمتوں سے ناآشنا ہو۔

شاعر۔ مفکر اور رہبر کی حیثیت سے اقبال کو ہمارے ادب میں اور زندگی میں وہ درجہ حاصل ہے جو آج تک مسلمانانِ ہند میں کسی اور شاعر۔ مفکر یا ادیب کو حاصل نہیں ہوا۔ فرداً فرداً ممکن ہے ہمارے بعض شعراء کا پایہ اقبال سے برتر ہو لیکن بحیثیت مجموعی اقبال ہمارے اردو شعرا میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں اور مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک نامعلوم طویل مدت تک اُردو شاعری میں اقبال کی حیثیت خاتم الشعرا کی رہے تو تعجب نہیں۔

صاحبو! جب اقبال نے اپنا کلام و پیام ملک کے سامنے پیش کیا اور یہ ہمارے آپ کے سامنے کی بات ہے تو ہر طرف سے مخالفت کا طوفان اٹھا لیکن ان کی زندگی ہی میں وہ وقت بھی آگیا جب ہم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اقبال کا قائل نہ ہو۔ ہم ان کے کلام کو صوری و معنوی ہر صورت سے سراہتے ہیں اور ان کو سب سے بڑا شاعر اور مفکر گردانتے ہیں۔ دنیا کی بڑی ہستیوں کی ایک بڑی پہچان یہ بھی ہے کہ ابتداء میں ان کی شدید مخالفت کی جائے آخر میں ان پر جان نثار کی جائے۔ اُردو میں ایک سے ایک بڑا شاعر مانا جاتا ہے۔ مگر ہمارے ذہنوں پر اقبال کی جو عالمگیر گرفت ہے وہ کمتر کسی کے حصہ میں آئی۔ یہاں تک کہ ہم میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اقبال کو خاصانِ خدا کے زمرہ میں رکھتے ہیں۔

اُردو شاعری میں فکر کا عنصر سب سے زیادہ غالب کے ہاں ملتا ہے۔ اُردو میں غالب پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شاعرانہ جذبہ میں مفکرانہ گہرائی

پیدا کی۔ اس کا اعتراف خود اقبال نے کیا ہے۔ غالب کے عجمی تصورات سے یہاں بحث نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ فلسفیانہ مسائل کو فلسفیانہ شاعرانہ انداز میں پیش کرنے کا سہرا غالب کے سر ہے۔ بعض غزلوں یا اشعار سے قطع نظر غالب کی زبان جہاں کہیں انھوں نے فکر و فلسفہ کو دخل دیا ہے عملی زبان بن گئی ہے۔ معتقدانہ شاعرانہ انداز میں شاعری کرنے کا امتیاز انیس و محسن کو حاصل ہے۔ گو میں اس کا بھی قائل ہوں کہ مرثیہ نگاروں میں انیس وہ ہیں جنھوں نے مرثیہ کے زور سے اپنی شاعری کو نہیں بلکہ اپنی شاعری کے زور سے مرثیہ کو چمکایا۔ زبان کے اعتبار سے انیس کو جو درجہ حاصل ہے وہ مسلّم ہے لیکن یہاں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ اردو بیشتر شاعرانہ زبان رہی ہے اس لئے ایسی شاعری میں جہاں خیالات سے زیادہ جذبات کی کارفرمائی ہو یہ خوب کام دیتی ہے اور یہی سبب ہے کہ جب کبھی اس میں ایسے عناصر داخل کئے گئے جو خالص شاعرانہ نہ تھے تو یہ ناہموار نظر آنے لگی۔ ایسی ناہموار کہ اس کے پرستار اس شاعری کے بھی قائل نہ رہے جس نے اس میں اپنا کلام پیش کیا۔ غالب اور حالی کا یہی حشر ہوا۔

اقبال کو بھی اس منزل سے گذرنا پڑا۔ انیس کا یہ کمال تھا اور مرثیہ کی خوش بختی کہ انیس نے مرثیہ میں وہ ساری خوبیاں جمع کر دیں جو دیگر اصناف سخن میں علیحدہ علیحدہ موجود تھیں۔ ان کے کلام میں غزل، قصیدہ، مثنوی مسدّس۔ حتیٰ کہ ڈرامہ اور افسانہ سب کے خصوصی امتیاز بڑے دلکش اسلوب میں سموئے ہوئے ملتے ہیں۔ میر کے بعد انیس کو زبان پر جو قدرت تھی وہ آج تک نہ دیکھی گئی نہ سنی گئی۔ اقبال کی زبان کا بھی یہی حال ہے میر و انیس کے مقابلہ میں آپ اقبال کی زبان کو شاید ناقابلِ التفات سمجھیں لیکن یہاں زبان سے مراد صرف روزمرّہ اور محاورہ اور اس قبیل کی باتیں نہیں ہیں بلکہ وہ زبان مدِّ نظر ہے جو شاعر نے اپنے کلام میں مخصوص ضرورتوں

کی بنا پر اختیار کی ہے اور کامیاب یا ناکامیاب رہا ہے۔ اس سلسلہ میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ اگر آپ اس پر غور کریں کہ اقبال کا موضوع سخن کیا ہے، اُن کا انداز تخاطب کیا ہے۔ اُن کی ذہنی پرداخت کیسی اور ذہنی پرواز کس طرف تھی۔ اُن کا مقصد کیا تھا اور اُن کے مخاطب کون ہیں تو آپ اقبال کی زبان کے قائل ہو جائیں گے۔ مجھے تو اکثر محسوس ہوا ہے کہ جہاں تک مسائل علمیہ و فکریہ کو شعر میں ڈھال کر دلنشین اور فکر انگیز بنانے کا تعلق ہے۔ غالب کی زبان سے اقبال کی زبان زیادہ متوازن و شگفتہ ہے گو یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ وادی کے کانٹے کا نکالنے کا کام غالب ہی نے کیا ہے اور اس طرح اقبال کے لئے زمین ہموار اور صاف ملی۔ روزمرّہ اور عام بول چال کی زبان سے یہاں بحث نہیں۔ اقبال کے ہاں اس زبان کا گذر نہیں۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال نے فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو جس ماہرانہ و شاعرانہ انداز سے اپنے اردو کلام میں منتقل کیا ہے اس سے ہندوستان میں اُردو اور فارسی دونوں کا وزن و وقار بڑھ گیا۔

اُردو شعرا میں ایسے اصحاب بھی نظر آتے ہیں جو شاعری کے علاوہ دوسرے علم و فنون پر بھی قدرت رکھتے تھے لیکن اس کا اثر ان کی شاعری پر بہت کم نظر آتا ہے۔ بعض شعرا علمی و فنّی مصطلحات کی رعایت اپنے کلام میں مدِّنظر رکھتے ہیں۔ ہم اپنے حسنِ ظن سے ان کو اس علم و فن کا امام قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ جو لوگ شاعر اور انشاء پردازانہ کے ہتھکنڈوں سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی رعایت و مناسبات کا فن جاننے سے دور دور تک تعلق نہیں۔ یہ سارا کرشمہ ضلع جگت یا رعایتِ لفظی کا ہے جو ایک زمانہ میں ہمارے شعر و ادب اور روزمرّہ کی صحبتوں میں بہت مقبول تھے بہی حال بڑی حد تک اُردو شاعری میں تصوف کا ہے اُردو میں ایسے شعرا بہت کم گذرے ہیں جو واقعتاً تصوّف سے لگاؤ رکھتے تھے یا جنھوں نے

تصوف کا مطالعہ کیا ہو۔ یہی سبب ہے کہ ہم کو اُردو شاعری میں زبانی کھیل زیادہ ملتا ہے۔

ہم میں ایک غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ شاعری میں جذبہ ہی سب کچھ ہے میں ایسے جذباتی شعرا سے واقف ہوں جو جذبہ کو خدا کی سب سے بڑی دین اور اپنا سب سے بڑا سرمایۂ افتخار گردانتے ہیں۔ جذبہ کو میں بھی خدا کی بہت بڑی دین سمجھتا ہوں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ وہ ہمارے شعرا کی شامت بھی بن گیا ہے اگر غور فرمائیے تو معلوم ہو جائے گا کہ جذبہ بجائے خود کوئی بڑی بات نہیں ہے اگر اس کو حرکت میں لانے اور صحیح راستہ پر لگانے کا ملکہ، فکر اور تجربہ شاعر کو نہ عطا کیا گیا ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ایک متنازعہ فیہ مسئلہ کی بھی ابتدا ہوتی ہے یعنی اقبال شاعر نہیں فلسفی ہیں یا ان کی شاعری پر فلسفہ غالب ہے۔

میرے نزدیک اِس سوال کا سیدھا سادھا جواب یہ ہے کہ اقبال کا درجہ (اور برگزیدہ شاعر کا درجہ) اس بحث سے کہیں بلند ہے کہ وہ شاعر پہلے ہیں فلسفی بعد میں یا اس کے برعکس بحیثیتِ مجموعی۔ شاعری میرے نزدیک مخصوص پیرایۂ اظہار ہے نہ موضوعِ بحث۔ تمیز ہو تو فلسفہ۔ سائنس منطق وغیرہ کو بھی شاعری کا رنگ و آہنگ دیا جا سکتا ہے اور سلیقہ نہ ہو تو حسن و عشق کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ چنانچہ میرے نزدیک اقبال کا شاعر ہونا ان کے فلسفی ہونے کا منافی نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے مفکر یا فلسفی ہونے سے انکی شاعری کی منزلت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ نرا شاعرانہ اور نری شاعری کا چسکا ہم کو غزل سے پڑا۔ یہاں تک کہ اکثر ہم غیر شعوری طور پر بھی یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ شاعری عبارت ہے غزل سے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ شاعری اور تغزل مترادف نہ سہی ان کا چولی دامن کا ضرور ساتھ ہے شاعری کا یہ تصور اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ اس سے ہمارے تمدنی مزاج کی غمازی ہوتی ہے

یعنی حسن و عشق تمامتر عبارت ہے عورت کے حسن سے اور عورت کے عشق سے۔

اقبال کا حسن و عشق اس سے علیحدہ بھی ہے، بلند بھی ہے اور شاید اِس کا منافی بھی لیکن اس بحث کو کسی دوسرے موقع کے لئے ملتوی کر دینا مناسب ہوگا۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اقبال کی عظمت کی نشانی ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کلام میں شاعر اور مفکّر دونوں نظر آتے ہیں۔ مفکّر اگر شاعر نہ ہو تو ممکن ہے ہم مشاعرہ میں واہ واہ کر لیں تنہائی و تکلیف میں وہ ہمارا مونس یار ہبر نہ بن سکے گا۔ اُردو شاعری میں خالص شاعر بھی گذرے ہیں۔ ان کی شاعری کو ہم اچھی شاعری بھی کہہ سکتے ہیں البتہ بڑی شاعری نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے یہاں اچھے شاعر بہت گذرے ہیں بڑے شاعر یقیناً بہت کم ہیں۔

اُردو شاعری میں صرف اقبال کی شاعری ایسی ہے جو ہم کو اُن علوم و مسائل تجربات و تحریکات کی طرف بے اختیار متوجہ کرتی ہے جو اس وقت عالمگیر ہیں اور جن کی گرفت عام اور تعلیم یافتہ ذہنوں پر ہے۔ انھوں نے دنیا کے اکابر اصحابِ فکر و عمل کے خیالات، تعلیمات اور جد و جہد کو اپنے کلام کے ذریعہ شاعرانہ لطف و نزاکت اور عالمانہ بصیرت و سنجیدگی سے پیش کیا کہ ہم کو ان اصحابِ فکر سے ایک طرح کا ذہنی ربط پیدا ہو گیا اور اس طور پر ہم نہایت آسانی کے ساتھ ان تمام عالمگیر ذہنی تحریکوں سے آشنا ہوئے جن سے کسی اور طرح ہمارے عامۃ الناس روشناس نہ ہو سکتے تھے۔ شاعری کا بڑا کمال اور اس کے لئے سب سے مستند سند جواز یہ ہے کہ وہ مُشکل گہرے اور نازک تصورات و خیالات کو بہت جلد زیادہ سے زیادہ دلوں میں اتار دیتی ہے اور یہ وہ کارنامہ ہے جو شاعری کے علاوہ کسی اور فن کو نصیب نہیں۔ اُردو شاعری میں یہ بات صرف اقبال کے ہاں ملتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اقبال نے ان افکار و تحریکات کی خوبی اور خامیوں کو اسلامی افکار و اعمال کی روشنی میں اس طرح پیش کیا جس سے ہمارے خواص و عوام دونوں

گمراہ ہونے کے بجائے بہرہ مند ہوئے۔

سیاسی لیڈر تو ہمیں پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن ذہن و فکر کو طاقت و تازگی بخشنے اور صحیح راستہ پر رہنمائی کرنے والا ہمیں عرصہ سے پیدا نہیں ہوا تھا۔ آج کل مادی ترقی کے ساتھ ذہنی ترقی کی جو رفتار رہی ہے اس سے عہدہ برآ ہونا معمولی ذہن و دماغ کا کام نہیں ہے آج کل سیاسی قیادت جتنی آسان ہے اتنی ہی ذہنی قیادت مشکل ہے۔ سیاسی قیادت اکثر چند افراد اور محدود مقاصد کی بنا پر حاصل ہو جاتی ہیں لیکن ذہنی قیادت ہر صدی میں صرف چند ایک کے حصہ میں آتی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں ہمہ گیر ذہنی قیادت بہت کم لوگوں کے حصہ میں آئی۔ یہ سعادت اور برگزیدگی اس صدی میں اقبال کو نصیب ہوئی۔ اقبال نے زندگی اور زمانے کے تقریباً تمام مسائل مہمہ پر حکیمانہ شاعرانہ یا شاعرانہ حکیمانہ انداز سے اظہارِ خیال کیا ہے اور کچھ ایسے دلکش اور موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ ہم میں ہر شخص خواہ وہ اس کے سمجھنے کی کافی استعداد رکھتا ہو یا نہیں ان مسائل کو سمجھنے سلجھانے کی کوشش کرتا ہے کامیاب ہوتا تو خوش ہوتا ہے اور نہیں کامیاب ہوتا ہے تو کامیاب یا مطمئن ہونے کی بار بار کوشش کرتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اقبال کے وسیلہ سے قوائے علمیہ و عملیہ کس طرح بیدار و بالیدہ ہوتے ہیں۔ اقبال کے کلام کی مثال اس متاعِ یوسفی کی ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے مصر کے اہلِ ثروت و اقتدار ہی نہیں بلکہ ایک بڑھیا بھی تھوڑی سی روئی لے کر بازارِ مصر میں آموجود ہوئی تھی۔ آپ سوچیں تو معلوم ہوگا کہ اقبال کی اس کرامت کا عام ذہنی نشو و نما اور ذہنی حوصلوں پر کیا عظیم الشان اثر ہے۔

اسلام نے اپنے پیرووں کو دین و دنیا کی اُن منزلوں پر فائز کر دیا تھا جن سے آگے یا جن سے بڑی کوئی منزلت نہ تھی۔ دنیا کی کوئی ترقی یا ذہن

وعمل کا کوئی کارنامہ ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کو سراسیمہ یا متحیر کر سکتا۔ مسلمانوں پر ایسا وقت بھی آیا جب وہ منزلت سے گر کر مذلت میں جا پڑے اور اس تصوّر نے کہ وہ سب کچھ تھے یا کر سکتے تھے لیکن کرتے کچھ نہ تھے اُن کو شدید نقصان بھی پہنچایا۔ یہ سب ہمارے آپ کے سامنے کی باتیں ہیں۔ ہم نے ہر طرح جتن کئے لیکن شعور کی بیداری جس کو ہم افراد کی نہیں جماعت کی بیداری سے تعبیر کر سکتے ہیں مُدتوں نصیب نہ ہوئی۔ مغربی اداروں اور مغربی افکار سے ہم مسحور و مرعوب ہوتے رہے۔ یہ حال عوام ہی کا نہیں تھا۔ بلکہ ہمارے خواص بھی اس کے شکار تھے۔ ہماری اکثر مستند تصانیف اور بیشتر ادارے اس پر گواہ ہیں۔ اقبال کے کلام کی گرمی اور تازگی، ان کی تعلیم کی گہرائی اور گیرائی اور ان کے بے پایاں خلوص سے ہمارے دلوں کے معلوم نہیں کب سے خشک سوتے ابل پڑے اور کتنے سوئے ہوئے ساز نغمہ سرا ہو گئے۔ ہندی مسلمانوں میں جو ہمہ جہت بیداری آج نظر آ رہی ہے اس کو جو نام چاہے دے لیجئے۔ یہ کرامت اقبال ہی کی ہے جس کے لئے غالب و انیس۔ حالی و اکبر۔ سرسید و شبلی نے زمین ہموار کر رکھی تھی۔

اقبال سے پہلے مسلمان تعلیم و یافتہ طبقہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کو واجب العمل سمجھنا تو درکنار ان کو تحریر و تقریر میں بطور سند پیش کرنا اپنی اور دوسرے کی ذہنی توہین سمجھتا تھا۔ یہ طبقہ اسلاف و اکابر کی روایات اور مذہبی و اخلاقی قدروں پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ اُردو شعر و ادب کو دوسرے شعر و ادب کے مقابلہ میں ہیچ سمجھتا تھا۔ ہر وہ چیز جو مغرب سے آئی ہو مُستند اور مشرق کا ہر تصوّر و تصویر مردود تھی۔ اقبال کے کلام و پیام نے ہمارے قلب و دماغ کی یکسر قلب ماہیت کر دی۔ اب کسی بحث میں اقبال کا کلام یا ان کے متفرق اشعار کو بطور دلیل پیش کرنا عام بات ہے۔ بعض فروعی باتوں سے قطع نظر اقبال نے وہی چیزیں پیش کی ہیں جو پہلے سے ہمارے ہاں

موجود تھیں لیکن نیا ذہن ان کی طرف مائل نہ ہوتا تھا۔ اقبالؔ کی تعلیم کی بنیاد قرآن۔ حدیث۔ ائمہ کے اقوال اور اسلاف کے کارناموں پر مشتمل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اقبالؔ نے ان باتوں کو جس قابلیت خلوص اور جرأت کے ساتھ پیش کیا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم خود اپنی نظروں میں محترم ہو گئے اور اس طور پر محترم بنے کہ دوسرے ہم کو محترم ماننے پر مجبور ہوئے یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری اور پیمبری کی حدود نہ صرف ایک دوسرے سے مل گئی ہیں بلکہ کچھ دور تک ایک ساتھ چلی گئی ہیں۔

ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اقبالؔ کو مفکرینِ یورپ کا خوشہ چین قرار دیتے ہیں۔ یہ غلطی نہیں تو غلط فہمی ضرور ہے۔ یہی نہیں بلکہ آج کل بعض حلقوں میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ خود اسلام اپنے پیشرو مذاہب سے ماخوذ ہے یا اُن کا خوشہ چین ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک بات یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اقبالؔ نے جو بات کہیں بھی مفید مطلب پائی اختیار کر لی اور باقی کو ترک کر دیا یہ سارے اعتراضات تسلیم کر لینے چاہئیں۔ یہ اعتراضات بڑی حد تک اسلامی تصوّرات کی تصدیق کرتے ہیں نہ کہ تکذیب۔ واقعات صحیح ہیں صرف ان سے نتیجہ غلط نکالا گیا ہے۔ اسلام نے اس کا کہیں اور کبھی دعویٰ نہ کیا کہ وہ دنیا کی تاریخی و تمدّنی آثار و کسر انکسار سے یکسر محفوظ و علیحدہ رہ کر ایک دن یک لخت آسمان سے نازل ہو گیا۔

وہ جملہ دوسرے ادیان کا ناسخ بھی ہے اور تصدیق کرنے والا بھی ناسخ اس لئے کہ اسلام دینِ کامل قرار دیا گیا۔ اس ہستی کے توسل سے جو اسلام کا مردِ کامل ہے اور اس طاقت نے اس کو کامل قرار دیا جس سے بڑی طاقت انسانی تصور میں نہیں آسکتی اور تصدیق کرنے والا یوں کہ وہ ان ادیان کو جھٹلاتا نہیں بلکہ ان کے بنیادی تصورات کی تصدیق کرتا ہے اس لئے اسلام میں اگر وہ باتیں ملیں جو اس سے پہلے کہ ادیان میں ملتی ہیں تو اس میں شرمانے، خفا یا

مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ اس سے اسلام کا درجہ فروتر کیونکر ہوا؟ کلامِ الٰہی یا مذہبِ الٰہی کے یہ معنی کب ہوئے کہ دنیا کے حالات وحوادث سے اُس کا تعلق نہ ہو۔ بذاتِ خود میں سمجھتا ہوں کہ اس دنیا کا خدا اسی دنیا کے ماضی وحال ومستقبل سے بیگانہ نہیں ہے اس لئے کہ دنیا کی تاریخ تقدیرِ الٰہی سے باہر نہیں ہے۔

اِس بحث کی روشنی میں اگر ہم یہ مان لیں کہ اقبالؔ نے مفکرینِ یورپ سے استفادہ کیا تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے اور اقبالؔ نے مفکرین کی انہیں باتوں سے سروکار رکھا ہو جو ان کے کلام وپیام کی تائید وتصدیق کرتے ہوں (دقیقتہ سے نہیں) تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں آپ کو اس مسئلہ پر بھی غور کرنے کی دعوت دوں گا کہ مفکرینِ یورپ کے اکثر بنیادی تصورات ان اسلامیوں کے تصرفات ہیں جو براہِ راست یا بالواسطہ یورپ پہنچے تو یورپ کے مفکرین کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے یہ بحث بڑی طوالانی ہے۔ اس صحبت میں میں صرف اقبالؔ کو مدِّنظر رکھنا چاہتا ہوں

اقبالؔ نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان پر فلاسفۂ مغرب کا کافی اثر تھا لیکن اس کے ساتھ اقبالؔ نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ مغربی مفکرین کے مطالعہ سے پہلے وہ ان اسلامی تصورات وعقائد سے بھی پورے طور پر بہرہ مند تھے جو کلامِ پاک کے مطالعہ کا نتیجہ تھے۔ میرے نزدیک ان دونوں بیانات میں تضاد نہیں ہے، کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ اقبالؔ مغربی مفکرین سے متاثر ہی اس لئے ہوئے کہ ان کے ذہن ودماغ میں وہ اسلامی تصورات رچے ہوئے تھے جو انسانی ذہن وعمل کو انسانی ارتقا کی اس وادی سے لے جاتے ہیں جس کا ایک سرا میلادِ آدم سے وابستہ ہے اور دوسرا معراجِ آدم میں پوشیدہ ہے۔

اس بحث میں گفتگو کی بڑی گنجائش ہے لیکن وقت میں گنجائش نہ ہونے کے سبب سے میں اس مسئلہ کو یہاں ختم کردینا چاہتا ہوں (۱۱ و ایضاً ۱۹)

نوجوان دوستوں کو جو اقبال کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں مشورہ دوں گا کہ وہ اقبال کے بنیادی تصورات کو ذہن میں رکھ کر کلامِ پاک کا مطالعہ کریں ان کو معلوم ہو جائیگا کہ اقبال پر قرآن کا اثر مغربی مفکرین کے اثر سے کہیں زیادہ نمایاں ہے۔ اور اقبال کو مغربی مفکرین کے تصورات سے دلچسپی ہی اس لئے پیدا ہوئی کہ ان کے تصورات کلامِ الٰہی سے ہم آہنگ ہیں اور اقبال ان مفکرین کے اسی حد تک ہمنوا ہیں جس حد تک قرآن پاک سے ان تصورات کی تصدیق ہوتی ہے۔

بعضوں کے نزدیک اقبال کے ہاں جہاں تہاں منطقی الجھنیں ملتی ہیں خودی اور خدائی کے حدود واضح نہیں ہیں۔ فوق البشر کا تصور کہیں کچھ ہے اور کہیں کچھ۔ وہ کبھی کسی ادارہ یا شخصیت کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی اس سے روگرداں ہو جاتے ہیں اور اس قبیل کی دوسری باتیں۔ لیکن یہ امور ایسے نہیں ہیں جن کی اہمیت اقبال کی عظمت پر غالب آسکے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دنیا میں خدا کی قدرت کا سب سے بڑا نمونہ انسان ہے اور انسان ہی وہ باشعور مخلوق ہے جو باعتبار خلقت اپنے خالق سے بہت قریب کا رشتہ رکھتا ہے اور یہ رشتہ "زندگی" کا ہے اس زندگی کا جو ہمیشگی سے پیوستہ ہے جو اوجھل ہوتی رہتی ہے معدوم نہیں ہوتی یہ زندگی خدا سے شروع ہوتی ہے اور خدا ہی پر ختم ہوتی ہے انسانی زندگی کبھی اس سے باہر نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی خودی ہمیشہ انسانی خودی رہے گی اور اس کی خودی کی معراج اس پر نہیں ہے کہ وہ خدا بن جائے بلکہ خدا کی صفات سے قریب تر ہو کر مرفع تر دمستحکم تر ہوتی رہے انسان کے خدا بن جانے میں میرے نزدیک انسان کی کوئی بڑائی نہیں ہے اس لئے کہ انسان کا خدا بن جانا انسانیت کے مقاصد میں نہیں ہے۔ استحکامِ خودی سے اقبال کا مقصد یہی ہے کہ وہ کسی ذات میں ضم نہ ہو۔ انسانی خودی کی انتہا صرف انسانی خودی کی انتہا ہے کسی اور کی ابتدا یا انتہا نہیں۔

یہ مسائل علمی نقطۂ نظر سے اہم ہوں تو ہوں مذہبی نقطۂ نظر سے ان کی کوئی اہمیت نہیں اس لئے کہ مذہب اِس بحث سے بلند بھی ہے اور

علیحدہ بھی ہے۔ دراصل اسلام میں کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ اسلام کا مدار چند بنیادی عقائد پر ہے اس کے بعد ان عقائد کے ماتحت تمام تر عمل پر ہے بذاتِ خود میں سمجھتا ہوں کہ عقائد کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ وہ سائنس فلسفہ اور ریاضی کی کسوٹی پر صحیح اتریں، عقائد کا مستحکم ہونا ضروری ہے۔ سائنٹفک ہونا بالکل ضروری ہے۔ فلسفہ دراصل مذہب کا گورستان ہے۔ دنیا کے مذاہب پر جو زوال آیا وہ غالباً اسی سبب سے ہے کہ ان میں فلسفہ کے جراثیم موجود تھے۔ اگر اسلام مذہب عمل نہ ہوتا تو رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شخصیت کو اس درجہ اہمیت نہ دی جاتی — رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے شجرِ اسلام میں نمی و نمو ہے یہی سبب ہے کہ اسلام پر بُرے سے بُرا وقت آیا لیکن اس پر کہولت یا فرسودگی طاری نہ ہوئی۔ انسانی جہد و عمل کا مذہب کبھی فرسودہ نہیں ہوا۔ درسِ خودی میں اقبال اسی جہد پیہم پر زور دیتے ہیں جس میں "محبت فاتحِ عالم" بھی شامل ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اقبال کے بیانات میں تضاد ملتا ہے اس کے بارہ میں صرف یہ کہنا ہے کہ اسلام کے خدا کی طرح اسلام اور اسلام کے شاعر میں بھی مختلف حیثیتیں مختلف مواقع پر برسرِ کار آتی ہیں۔ اسلامی سیرت و شخصیت میں "پولاد" و "پرنیاں" دونوں ملتی ہیں۔ "ضربتِ کاری" بھی اور "خودیٔ دلنوازی" بھی لیکن اس بحث کو یہاں ختم کر دینا چاہئے

صاحبو! میں نے اقبال کا کلام بار بار پڑھا ہے۔ ہر حال میں پڑھا ہے ہر حال میں پڑھا ہے موقع پر پڑھا ہے مجھے ہمیشہ کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اقبال کا کلام اس آسمان کی مانند ہے جس کے نیچے ہم آپ بستے ہیں۔ جاڑے گرمی برسات میں اس فضائے نیلی پر کیسے کیسے سماں نظر آتے ہیں جو کبھی یکساں نہیں ہوتے جن میں زندگی کی بوقلمونی نظر آتی ہے اور کچھ نہیں تو برسات میں آپ نے دیکھا ہوگا اس لباط پر کیسی کیسی نیرنگیاں نظر آتی ہیں۔ اور آپ کے ذہن میں کیسی کیسی رنگین پُر اسرار ڈرانے والی

تسکین دینے والی ۔حوصلہ دلانے والی۔ تصویریں اور تصورات جیسے جیتے جاگتے۔ ہنستے بولتے

"دم بدم بامن وہر لحظہ گریزاں ازمن"

جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے کشمیر کی زمین و آسمان جن کو جب دیکھئے جس حال میں دیکھئے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور محسوس ہوگی جو پہلے نہ ہوئی تھی۔

آپ کو یاد ہوگا میں نے عرض کیا تھا کہ اقبال کا کلام و پیام ہماری زندگی کی سرگرمیوں میں غیر معمولی طور پر دخیل ہے۔ اقبال کے کلام و پیام سے مسلمانانِ ہند میں ایک جدید نشاۃ الثانیہ کی ابتدا ہوتی ہے ہماری زندگی کا کون سا شعبہ ایسا ہے جہاں اقبال کے کلام و پیام سے ہم کو مکمل رہبری نہیں ملتی۔ اُن کے فلسفہ نے علمِ کلام کا دروازہ کھولا۔ شعر و ادب میں نئی قدریں سامنے آئیں۔ تعلیمی مسائل میں اقبال کے کلام سے روشنی اور گرمی دونوں ملتی ہیں (پروفیسر سیدین نے کچھ دن ہوئے ایک مبسوط تصنیف میں اقبال کے ان نظریوں کو پیش کیا ہے جو تعلیم کی مانے جاتے ہیں) ہماری موجودہ سیاسی تگ و تاز میں اقبال کے کلام کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جماعت کی شیرازہ بندی میں اقبال کی تعلیم نے وہ کام کیا جو اب تک پورا نہ ہوا تھا۔ اقبال ہی کے تصرف سے ہم کو اپنے علمی و تمدنی ورثہ کی عظمت کا احساس ہوا اور قومی شعور کی صحیح راستہ پر نشو و نما ہوئی۔ اقبال کے کلام و پیام سے مجدد الف ثانیؒ شاہ ولی اللہؒ اور حضرت اسمٰعیل شہید کے کارناموں کو از سرِ نو تازگی و تابندگی ملی۔

ہمارے ادب میں اتنا جامع حیثیات شاعر اب تک نہیں پیدا ہوا جو بیک وقت اپنی قوم میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا معلم و مفکر تھا۔ اس کی یادگار منانا اور اس کے بتائے ہوئے راستہ کو اختیار کرنا سعادت مندی بھی ہے اور اقبال مندی بھی۔ خدا آپ کی مدد کرے۔

گنجِ بادآورد

اقبال

اور

اُن کی شاعری[1]

[1] "عزیزانِ ندوہ کے نام" دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ۔ ص ۶۶ تا ۸۵ پروفیسر صاحب نے یہ خطبۂ صدارت ۳۰ ستمبر ۱۹۶۷ء کو دارالعلوم ندوہ لکھنؤ میں تقسیم اسناد کے موقع پر دیا۔

اقبالؔ اور غالبؔ ہمارے وہ یگانۂ روزگار شعرا ہیں جنھوں نے اُردو زبان اور اُردو شاعری کا حسب ونسب بلند کیا۔ غالبؔ نے فارسی کے سہارے سے اُردو کے نسب کو ولی اور ان کے چند پیشروؤں سے آگے بڑھا کر رودکی سے ملا دیا۔ اس فارسی کے سہارے جو صدیوں پہلے سے ہندوستان کی فضا میں نشو ونما پا رہی تھی اور اپنے لوک پلک سے اور آب و رنگ کے اعتبار سے سبک ہندی کہلائی۔

دوسری طرف اقبالؔ نے فکر کی بلندی۔ جذبہ کی طاقت وطہارت اور تخیل کی نادرہ کاری سے اس کو مثنوی مولوی معنوی تک پہنچا دیا۔ اقبالؔ نے فارسی کو اُردو سے ربط دے کر اس کو حُسنِ بیان اور زورِ بیان دیا جو اعلیٰ بیانیہ شاعری کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ بیانیہ شاعری میں المیہ وطربیہ مثنویاں ہی نہیں بلکہ وہ شاعری خاص طور پر آتی ہے جس کا نمونہ مولانا روم کی مثنوی ہے۔ اقبالؔ کی مختلف چھوٹی بڑی نظموں میں اِس صنفِ شاعری کے بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اُردو میں جب کبھی مہا بھارت یا ڈوائن کومیڈی کے انداز کی کوئی چیز لکھی گئی تو اس کی زبان۔ انداز اور سطح وہی ہوگی۔ جو اقبالؔ نے مقرر کردی ہے اس طور پر اقبالؔ نے اُردو اور اُردو شاعری کو "نسب" ہی نہیں "حسب" بھی دیا ہے۔

اُردو میں فارسی آمیزی غالبؔ اور اقبالؔ دونوں نے کی۔ اِس فرق کے ساتھ کہ اُردو میں غالبؔ کے لائے ہوئے فارسی الفاظ کھٹکتے ہیں۔ جیسے اُردو

میں امتزاج نہ پا سکے ہوں۔ اقبال کی اُردو میں وہ اس خوبی سے ترکیب پا گئے ہیں جیسے وہ لفظ۔ فقرہ یا عبارت اُردو کے منجملہ اسبابِ حسن ہو اور ظاہر ہے جو چیز اُردو سے ربط پا جائے گی وہ "بچشمِ مستِ ساقی دام کردن" کا کیا نمونہ پیش کرے گی۔ تعجب اس بات کا ہے کہ اُردو اور فارسی سے غالب جتنے آشنا تھے اور زبان کی جس ٹکسال میں وہ رہتے تھے۔ اقبال کو نصیب نہ تھیں۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ اعلیٰ شاعری کی زبان اہلِ زبان نہیں بلکہ اعلیٰ موضوعات کا اعلیٰ شاعر متعین کرتا ہے۔

ایسے شاعر کم گذرے ہیں جنہوں نے اقبال کی مانند اپنی شاعری سے قوم کی تقدیر بدل دی ہو اور اس قوم نے از سرِ نو اپنی بازیافت کی ہو۔ ظاہر ہے ایسی شاعری کی پرداخت میں شاعر نے فن، زبان تاریخ، تہذیب اور زندگی کے کتنے اور کیسے کیسے مُعظمات کا لحاظ رکھا ہوگا۔

(اقبال کا کلام حیرت انگیز حد تک ہر طرح کے حشو و زوائد اور رسمی روایتی تکلّفات سے پاک ہے۔ کہیں بھی کوئی لفظ۔ فقرہ یا عبارت یا مفہوم ایسا نہ ملے گا جو شاعر کے عجزِ بیان کی غمازی کرتا ہے یا ضرورتِ شعری یا خانہ پُری کے لئے لایا گیا ہو اور کونسی سنجیدہ صنفِ شاعری ایسی ہے جس میں اقبال نے اردو کے بڑے سے بڑے شاعر سے کمتر درجہ کا شعر کہا ہوگا۔ کمتر کا لفظ میں نے بربنائے احتیاط استعمال کیا ہے ورنہ زیادہ صحیح لفظ کام میں لانا۔

اقبال نے اپنی اعلیٰ تخلیقات کے لئے "عبارت۔ اشارت اور ادا" کے جیسے برمحل حسین اور بے مثل پیکر تراشے ہیں یا صوت و ساز وضع کئے ہیں وہ بجائے خود اقبال کے غیر معمولی حسن آفرین اور حسن کار جینیس genius ہونے کی دلیل ہے اس وادی میں بھی اقبال کا ہمسر کوئی اُردو شاعر نہیں۔ خوبصورت الفاظ اور ترکیبیں۔ تشبیہ و استعارے بعض دوسرے شعرا کے یہاں بھی معمول سے زائد ملیں گی۔ لیکن موضوع و محل سے معنوی اور اس کا

اثر وقتی اور سطحی ہوگا۔ جیسے یہ الفاظ اور ترکیبیں وسیلہ کے طور پر نہیں مقصد کے طور پر وہ بھی مشتبہ مقصد کے لئے کام میں لائی گئی ہوں۔ مقصد تاثیر نہیں۔ نمائش ہو اور شاعر کے پاس کہنے کو کچھ نہیں دکھانے کو سب کچھ ہو۔ شاعروں میں کسی وقت مرصع کاری بہت مقبول تھی اور اس کے لوازم میں سمجھی جاتی تھی لیکن مرصع کاری دراصل زبانی اور شاعری کے ابتدائی عہد کے تکلفات میں سے ہے۔ جن سے دونوں بہت جلد نکل جاتے ہیں چنانچہ اب ٹگوریت اور ادبِ لطیف اُردو نثر اور مرصع کاری اُردو نظم میں شاید ہی کہیں نظر آئے۔ حالی کی انسانیت دوستی۔ حقیقت پسندی اور خوب سے خوب تر کی تلاش نے اُردو شاعری میں اس کے چلن کو معطل اور اقبال کے

چہ باید مرد را طبعے بلندے مشربے تابے
دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جان بیتابے!

نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ یہاں مرد سے ہم سے آپ سے زیادہ شاعر مراد ہو تو عجب نہیں۔

اقبال سے پہلے اُردو میں حمد و نعت۔ معراج۔ معجزہ۔ مرثیہ و مناجات کی روایتی یا دیندارانہ شاعری ہوتی تھی جس کا مقصد زیادہ تر ثواب حاصل کرنا ہوتا۔ محسن کاکوروی کی چراغِ کعبہ اور انیس کے مراثی میں یہ انداز نمایاں طور پر ملتا ہے۔ جسے لکھنؤ اور لکھنویت نے مخصوص شان اور سطح دیدی تھی۔ اقبال نے بھی ان موضوعات کو اپنایا لیکن ان کا مقصد اور محور بدل دیا۔ اس لئے کہ وہ ملت کو مذلت سے نکال کر آزمائش و آرزومندی کے راستے پر لانا چاہتے تھے۔ تفصیل میں طوالت ہے۔ کچھ نزاکت بھی۔ اسلئے چاہتا ہوں کہ آپ خود کلامِ اقبال کا مطالعہ کریں اور غور فرمائیں کہ اگلوں نے مذکورہ صدر عنوانات پر جس طرح طبع آزمائی یا دین داری کی ہے

اُس کے مقابلہ میں اقبال نے فکر و عمل کی کیا دعوت دی ہے۔ اُس کے بعد یہ دیکھیں کہ بحیثیت مجموعی ملت کے کردار اور کارنامے نیز اردو شاعری کے وزن اور وقعت کے بڑھانے میں ایک طرف اقبال اور دوسری طرف ان کے پیشروؤں کا کیا اور کیسا رول رہا ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ملت کی شاعری اور دینداری کی شاعری میں کیا تفاوت ہے اور اسبارہ خاص میں ہم آپ اور ہمارا شعر و ادب دونوں کی نظر میں کتنے ارجمند اس لئے اقبال کے احسان مند ہیں۔

بعض حلقوں میں اقبال کی شاعری اور اس کے تصرفات و فتوحات کو مذہبی۔ اسلامی یا ماضی (مطلق!) کی شاعری قرار دیکر قابلِ اعتراض یا ناقابلِ التفات بتایا جاتا ہے۔ یہ تنقید نگاری کی وہ اونچی منزل ہے جہاں اس کی سرحد روشن ضمیری سے جا ملتی ہے۔ کسی قوم یا شعر و ادب کے مذہبی ہونے میں کیا قباحت ہے اگر وہ قوم انسانیت دوست اولوالعزم علم و فن کی علمبردار اور اقتدارِ جلیلہ کی حامل ہے اور اُس کا شعر و ادب کا یکساں بڑا شاعر ہے اس لئے قابلِ تکریم ہوتا ہے وہ جن عظیم اقدار اور حقائق کو پیش کرتا ہے وہ فی نفسہٖ ہر ملک و ملت اور شعر و ادب کے لئے پیش قرار اور قابلِ قبول ہوتے ہیں صرف ان اقدار و حقائق کو پیش کرنے کا انداز اور سطح بدلی ہوتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ جتنے بڑے شاعر اور فنکار ہوتے ہیں اکثر اس پائے کے تنقید نگار نہیں ہوتے تاوقتیکہ کوزہ، کوزہ گر اور گل کوزہ ایک ہی نہ ہو۔ جیسا کہ ہمارے شعر و ادب میں اکثر نظر آتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قارئین و ناظرین شاعر تک پہنچ نہیں پاتے۔ تنقید نگار کے ساتھ برخود غلط۔ گمراہ یا وا ماندہ راہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اقبال کے ایک شعر میں کبوتر پر شاہین کے جھپٹنے کا جو قصہ ہے جس پر احتجاج کرنے کے لئے سیکورٹی کونسل سے درخواست کی جایا کرتی ہے کہ امنِ عالم کے تحفظ کے لئے وہ مسلسل

"باجلاس کونسل" رہے۔ درحقیقت کسی کمزور پر دست آزار کی تاخت وتباہ کاری کی دعوت یا اعلان نہیں ہے۔ بلکہ خطرے (ایمرجنسی) کے موقع پر اپنے آپ کو مستعد اور فعال (ALERT AND ACTIVE) رکھنے کی مصلحت ذہن نشیں کراتی ہے۔ جس طرح صلح کے زمانہ میں جنگ کے مطالبات کے پیشِ نظر فوج کے سپاہیوں کے خون کو گرم اعصاب وعضلات کو فشار آزمودہ اور شہامت وشجاعت کو تازہ وتیز رکھنے کے لئے برّی اور بحری اور فضائی قواعد پریڈ بلکہ مصنوعی جنگ کراتے ہیں۔ مثال سے سراسیمہ نہیں شعروادب کا رمز شناس ہونے کا ذوق وظرف پیدا کرنا چاہئے۔ شاہین وکبوتر کی حکایت صرف تمثیل ہے تبلیغ ہرگز نہیں۔

ہندوستان میں غالب۔ ٹیگور اور اقبال کا شمار کچھ اور نہیں تو انیسویں اور بیسویں صدی ہندوستان کے سرآمد شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی اہمیت عظمت کو یہ کہہ کر محدود یا داغدار نہیں کرنا چاہتے کہ یہ مسلم ہے یا وہ غیر مسلم۔ رومی کی قدوقامت کا شاعر رومی سے قبل یا ان کے بعد اقبال کے سوا مسلمانوں میں کہیں نہیں پیدا ہوا۔ یہاں اس امر کو بھی نظرانداز نہیں کرسکتے کہ رومی کے زمانے اور زندگی کا موازنہ اقبال کے زمانے اور زندگی سے کریں تو آسمان اور زمین کا فرق نظر آئے گا۔ بیسویں صدی کے پہلے پچاس سال میں دنیا جس طرح زیروزبر ہوئی ہے اور جدید نے قدیم پر جس سفاکی سے غلبہ پایا ہے اور جدید خود جس سرعت سے قدیم ہوتا رہتا ہے اس کی مثال تہذیب وتمدن کے پچھلے پانچ ہزار برس میں نظر نہ آئیگی۔ اس اعتبار سے رومی اور اقبال کے فکر وفن کے حدود اربعہ ابعاد ثلاثہ اور کیف وکم کا اندازہ لگانا چاہئے۔ اقبال نے وہ زمانہ پایا جب سائنس ٹکنالوجی۔ سیاسیات، عمرانیات۔ ادب۔ الٰہیات، عقلیات اور دیگر علوم کے کسروانکسار یا خانہ جنگی اور ان سے برآمد ہونے والے

نت نئے اور پیچیدہ تر مسائل کا سامنا تھا۔ دنیا کی دو ہولناک ترین جنگوں نے سوچنے اور عمل کرنے کے معیار و میزان کو یکسر بدل دیا تھا۔ نفس کے مطالبے روح کے تقاضوں پر تیزی سے غالب آ رہے تھے۔ اسلام کی تائید تحفظ اور ترقی کے جتنے بے شمار سنگین مسائل اور کافر ذہنوں کا اقبال کو سامنا تھا رومی کا دور ان سے قطعاً خالی تھا۔ رومی نے اپنی مثنوی میں جو تکنیک اختیار کیا وہ آسان تھا۔ اس کو تنقیدی نظر سے دیکھنے اور پرکھنے پر کسی کو کبھی اصرار نہ ہوا۔ اقبال نے رومی سے کہیں زیادہ نازک، مشکل اور متنوع مسائل پر ان تمام لوازم کو پورا کرتے ہوئے واضح اور مکمل فیصلے صادر کئے ہیں جن کا آج کل کے علوم و فنون اور کیسے سخت گیر علوم و فنون مطالبہ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ اس کارنامے کو بھی نظر میں رکھئے کہ انھوں نے اپنے ذہن کی بے مثل ثروت سے اردو شعر و ادب کی ثروت میں گرانقدر اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ اردو شاعری کو ایسا اسلوب و آہنگ دیا جو آجتک اردو کا کوئی شاعر یا فنکار نہ دے سکا تھا اور معلوم نہیں کب تک اس کی خوبی اور خوبصورتی پر اضافہ کرنے والی جینیس (genius) ظہور میں نہ آئے۔ اس بیان سے رومی یا غالب کو اقبال سے فروتر دکھانا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ کوئی بڑا شاعر اپنا درجہ کبھی نہیں کھوتا۔ بعد کے آنے والے شاعر نہ اس کو پیچھے ڈھکیلتے ہیں نہ اس کی جگہ لیتے ہیں بلکہ شاعری میں ایک نئے حسب و نسب یا سطح اور سمت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اردو کی اعلیٰ شاعری میں اقبال وہ نابغہ (جینیس) ہیں جو نامعلوم مدت تک "نابغہ ممتنع" کی حیثیت رکھیں گے۔ (اس سے بحث نہیں کہ قواعد کی رو سے "نابغہ ممتنع" کی ترکیب صحیح ہے یا نہیں۔ واقعہ صحیح ہو تو ترکیب بھی جلد یا بدیر صحیح ہو جاتی ہے) اور یہ اقبال برہمن زاد اور ہندوستان نژاد تھے، ہندوستان کا عالمِ اسلام کو اقبال کی پیش کش ہندوستان کے کسی کو قابلِ فخر محسوس

ہو یا نہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہمیشہ رہے گی۔

اقبال پر یہ بھی اعتراض ہے کہ وہ مغرب کی ہر بات کے خلاف ہیں خواہ وہ مناسب و معقول ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح کا اعتراض اقبال پر تو کیا ان کے کلاسیکی ملازم علی بخش پر بھی عائد نہیں ہوتا جس سے ڈاکٹر اقبال بے تکلف تھے۔ مغرب کی بہت سی خوبیوں سے انکار اقبال کے بعض بنیادی تصورات سے انحراف کا موجب ہوگا۔ انھوں نے مغرب کی جن باتوں کو امنِ عالم اور عظمتِ انسان کے خلاف پایا۔ انہی کی مذمت کی ہے۔ نکتہ چینیوں میں کوئی ایسا ذوق وظرف رکھنے والا نہیں ہے جو اس کی داد دے سکے کہ اقبال نے (بالفرض) بے جا اعتراض بھی کس بے مثل انداز اور الفاظ میں کیا ہے۔ کاش دو ایک مغرب اور ہوتے تاکہ اقبال کے کچھ اور زندہ جاوید اشعار کا ہمارے شعر و ادب میں اضافہ ہو جاتا۔

(اقبال کو اس جہاں سے رخصت ہوئے کم و بیش تیس سال ہوئے۔ اِس دوران میں مغربی طاقتوں اور ان کے چھوٹے بڑے حواری اور حلیفوں نے پسماندہ و درماندہ اقوام اور ممالک سے جو سلوک کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں اس کا مقابلہ اقبال کے عہد سے کریں تو بیک وقت بغاوت اور بیچارگی محسوس کرنے کے ساتھ دل بے اختیار چاہنے لگتا ہے کاش پرانا اقبال زندہ ہوتا یا نئے اقبال کا ظہور ہوتا۔ بالِ جبریل میں اقبال نے جن غزلوں میں مغرب کی جن معاصی کا ذکر کیا ہے اور اکثر کیا ہے وہی حاصلِ غزل ہیں۔ یوں بھی ہم جانتے ہیں کہ اقبال ہی ایسے شاعر ہیں جن کی غزلوں کا ہر شعر حاصلِ غزل ہوتا ہے۔ اشعار اور اعتراض کو نظر میں رکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ معترض نہ مغرب کے گناہوں کو جانتا ہے نہ اقبال کی بصیرت کا قائل ہے نہ ان کی غزلوں کا ادا شناس ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا شمار عہد کے ممتاز مفکرین

دانشوروں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ اقبال کے معرف اور ان کے کلام کے مانے ہوئے مبصر ہیں۔ اردو ہفت روزہ جٹان لاہور مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۶۷ء میں اس کے مشہور و محترم ایڈیٹر آغا شورش کاشمیری کے مضمون سے حسبِ ذیل اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:۔

"اقبال کے افکار کا ایک ثلث مغربی افکار و استیلاء کے خلاف احتجاج پر مشتمل ہے۔ خود حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی نشاطِ ثانیہ تقلید مغرب میں نہیں ہے لیکن فکرِ اقبال کے مولف (خلیفہ عبدالحکیم مرحوم) کیا فرماتے ہیں اس اقتباس سے ظاہر و باہر ہے:"

"اقبال کے ہاں مغربی تہذیب کے متعلق زیادہ تر مخالفانہ تنقید ہی ملتی ہے اور یہ مخالفت اس کے رگ و پے میں اس قدر رچی ہوتی ہے کہ اپنی اکثر نظموں میں جا و بے جا ضرور اس پر ایک ضرب رسید کر دیتا ہے۔ مجموعی طور پر اثر ہوتا ہے کہ اقبال کو مغربی تہذیب میں خوبی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ اس کے اندر اور باہر فساد ہی فساد دکھائی دیتا ہے۔ گویا یہ تمام کارخانہ ابلیس کی تجلی ہے۔ بعض نظمیں تو خالص اسی مضمون کی ہیں۔ اپنی غزلوں میں بھی حکمت و عرفان تصوف اور ذوق و شوق کے اشعار کہتے تھے یونہی ایک آدھ ضرب کو رسید کر دیتے ہیں۔ بال جبریل کی اکثر غزلیں بہت ولولہ انگیز ہیں اکثر اشعار میں حکمت اور عشق کی دلکش آمیزش ہے لیکن اچھے شعر کہتے کہتے ایک شعر میں فرنگ کے متعلق غصہ اور بیزاری کا اظہار کر دیتے ہیں اور پڑھنے والے صاحبِ ذوق انسان کو دھکا سا لگتا ہے کہ فرنگ

عیوب سے لبریز سہی) لیکن اس کا ذکر ہی نہ کیا جاتا تو اچھا ہوتا۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مُصفّا آبِ رواں کا لب جو بیٹھے لُطف
اُٹھا رہے تھے کہ اس میں یک بیک ایک مردہ جانور کی
لاش بھی تیرتی ہوئے سامنے آگئی۔ اگر کہیں ملّا کو بُرا لکھنا
ہے جو تہذیبِ افرنگ کی طرح اقبال کے طعن و طنز کے تیروں
کا ایک مستقل ہدف ہے تو اس کے ساتھ ہی فرنگ کو
بھی لپیٹ لیتا ہے حالانکہ غزل کے باقی اشعار نہایت
حکیمانہ اور عارفانہ ہوتے ہیں۔ مثلاً غزل کا مطلع ہے ؎

ایک دانش نورانی ایک دانش برہانی
ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی

باقی اشعار بھی اسی پائے کے ہیں لیکن چلتے چلتے ایک شعر
یہ بھی فرما دیا جس میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو مُتہم کیا ہے۔

؎ مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اِس دور کے مُلّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

مگر افرنگ میں جو ظاہری پاکیزگی اور حسن و جمال ہے اقبال
اُس کا منکر نہیں۔ تمدّنِ فرنگ کے اس پہلو کو جو اس کو ایشیا
کی گندگی سے ممتاز کرتا ہے اقبال بھی قابلِ رشک سمجھتا ہے
اور چاہتا ہے کہ مشرق میں بھی جنتِ ارضی کے نمونے
نظر آئیں ؎

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا قریہ ہے فردوس کی مانند

اسی غزل کے ایک شعر میں پھر تہذیبِ جدید اور ملائیت
پر ایک تازیانہ رسید کیا ہے ؎

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

. . . . . اور کئی غزلوں میں یہی کیفیت ہے کہ بات کچھ بھی ہو رہی ہو لیکن ضرب لگانے کے لئے فرنگ کا ذکر کرنا لازمی ہے ؎

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے تیرا
تری خودی پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

. . . . . افرنگی راج ختم ہو گیا۔ اور باقی جاں بلب ہے آئندہ نسلوں کے لئے افرنگی راج تاریخ کا ایک قصہ بن جائے گا۔ اُس زمانے میں اِس شعر سے کون لطف اُٹھائے گا۔ پچاس یا سو سال کے بعد غالباً اس وجہ اور غزل گو گانے والے اِس شعر کو ساقط کر دیں گے لیکن غلبۂ افرنگ نے بے چارے اقبال کو اس قدر بیزار کر رکھا ہے کہ وہ ایسی غزل میں بھی اس کے ذکر سے باز نہیں آ سکتا . . . . . "

. . . . . علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمدؒ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ اس کا ذکر خلیفہ صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ ذرا غور کر لیجئے کہ خلیفہ صاحب کے قلم کی نفریدہ پائی کیا گل کتر گئی ہے۔ ایک محمدؐ کی کیفیت ان میں یہ بھی تھی کہ وہ (شیخ نور محمدؒ) نبی امی کی طرح نوشت و خواند کے معاملہ میں امی تھے۔

"چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است!"

(فکر اقبال۔ ص ۱۸۲۔ بزمِ اقبال لاہور ۱۹۶۱ء)

یہ بیان اقبال کے مانے ہوئے شارح کا ہے لیکن اقبال کے معمولی طالب علم کے نزدیک بھی کسی مزید تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ خلیفہ صاحب کے نزدیک تہذیبِ افرنگ پر اقبال کی تنقید اس لئے بھی بے سود ہے کہ غلبۂ افرنگ کے ختم ہوجانے کے بعد اقبال کے ان اشعار کی ساری اہمیت اور خوبی ختم ہوجائے گی اور کوئی بھی ان کو قابلِ اعتنا نہ پائے گا۔ یہ دلیل کچھ اس طرح کی ہے جیسے چاند پر ہماری آمد و رفت ہوجائے گی تو اس کا جمالیاتی تصوّر ہمارے شعر و ادب ہمارے حسن و خیال، حسن احساس اور حسن بیان سے مفقود ہوجائے گا۔ حالانکہ انسانی ذہن میں چاند حسن کا سمبل (نشان یا علامت) بن چکا ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ چاند کا حشر سادھوؤں اور طالب علموں کے ہاتھوں کیا ہوگا۔ افرنگ کا تسلط جلد یا بدیر ختم ہوکر رہے گا۔ یوں بھی کسی کا تسلّط دَوامی نہیں ہوتا صرف اس دور اور اس کے زعماء کو خیر و شر یا شامت و شادمانی کا سمبل قرار دیتے ہیں۔ فراعنہ۔ عاد و ثمود اور ان کے کید و کیائر کا عہد کب کا ختم ہوچکا اس طرح معلوم نہیں کون کون سی دوسری قومیں اور حکومتیں جن کا ذکر مستند دستاویزوں میں ملتا ہے صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں لیکن اُن کے کارنامے یا کرتوت ہر زمانے میں یاد رکھے جاتے ہیں اور لوگ ان سے سبق سیکھتے ہیں۔ تعجّب ہے خلیفہ صاحب جیسا ماہر نفسیات اس رمز کو نظر انداز کردے کہ اعلیٰ شعر میں کوئی حال حادثہ یا کردار بیان ہوجاتا ہے تو وہ انسان کے ذوق و ضمیر میں نقش ہوجاتا ہے اور ہمیشہ فعال رہتا ہے شعر کی ایک بات میں خلیفہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو حسبِ لب و لہجہ میں اور ان کے اشعار کو حسبِ تشبیہ کے ساتھ پیش کیا ہے وہ بھی حفظِ مراتب کی ایک اچھی مثال نہیں ہے۔

اقبال کے کلام پر تنقید کا ایک نمونہ اور ملاحظہ فرمائیے۔ یہ

اقتباسات انجمن ترقی اُردو ہند کے ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" کے ۲۲ اپریل ۱۹۶۷ء کے اداریہ سے اخذ کئے گئے ہیں :۔

"....... کبھی کبھار شاعر خود اپنے کلام کا بہترین نباض نہیں ہوتا۔ اقبالؔ نے جب یہ کہا کہ لوگ مجھ سے آب و رنگِ شاعری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ میں انھیں شکوہِ خسروی دیتا ہوں اور تختِ کسریٰ اُن کے قدموں میں ڈال دیتا ہوں تو اقبالؔ نے بھی اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ شاعری اپنی قیمت آپ ہے۔ اگر وہ شکوہِ خسروی دیتی ہے یا نہیں تو اس سے اس کی خوبی یا خامی نہیں دیکھی جاتی...."

اقبالؔ اور ان کی شاعری پر بڑے مخلصانہ اور جامع انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"وہ اردو کا بہت بڑا شاعر ہے اور میرؔ، غالبؔ۔ نظیرؔ انھیں کے صف میں ہیں مگر آج اقبالؔ کی شاعری کی تقلید نہ ممکن ہے نہ مناسب۔ زندگی بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ اقبالؔ کا فکر و فن ہمارے لئے آج بھی بڑی مسرت و بصیرت رکھتا ہے مگر اس دور کے درد و داغ اور سوز و ساز کو شعر میں ڈھالنے کے لئے اقبالؔ کا فن ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ ہمیں اس کے لئے اور سادہ اور دھرتی سے قریب اور بول چال کے مطابق اور کنایاتی اور طنزیہ ہونا پڑے گا اور خاص بےباک حقیقت نگاری کی ضرورت ہوگی۔ خطابت یا حکمت دونوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ کبھی سرگوشی کے انداز میں باتیں کرنی ہونگی کہیں خود کلامی کے لہجے میں۔ کبھی اپنے آپ سے کچھ سوال

کرلے ہوں گے۔ کبھی دو یا تین لہجوں کو یک جا کرنا ہوگا
آدم کو آدابِ خداوندی سکھانے سے آدم کا اپنے آپ
کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس دور میں سب سے اہم کام اس
آدمی کی تلاش ہے جس کے پیچھے پانچ ہزار سال کی
تہذیب کی تاریخ اور اس سے پہلے کے جانور کی لمبی
کہانی ہے۔ اس کام میں میرؔ۔ نظیرؔ۔ غالبؔ۔ اقبالؔ
سبھی سے ہم کو مدد ملے گی اور ان سب کی مدد سے
اُردو شاعری کا نیا لہجہ اور نیا آہنگ متعین ہوگا۔
اقبالؔ اپنی زندگی میں ہی کلاسک کی عظمت کے حامل
ہو چکے تھے۔ اور کسی کلاسک سے ہم کبھی بے نیاز نہیں
ہو سکتے۔ مگر کلاسک کو پیر تسمہ پا نہیں ہونا چاہئے وہ
ہمیں فکر و فن کے چراغ دیتا ہے۔ جس کی مدد سے ہم
اپنے چراغ روشن کر سکتے ہیں۔"

شعر و ادب کی مُنصفانہ و مخلصانہ تنقید سے انسان۔ معاشرہ زندگی اور عقائد کی مُنصفانہ و مخلصانہ تنقید کا ملکہ پیدا ہوتا ہے اس لئے کہ شعر و ادب زندگی ہی سے برآمد ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ زندگی کے کاروبار میں مرنجان مرنج ہونا کام نہیں آتا ہے۔ تنقید میں یہ طریقہ خرابی لاتا ہے اس لئے کہ زندگی تمام تر عمل سے عبارت ہے جس میں جہاں تہاں نیچ اونچ کا راہ پا جانا تعجب کی بات نہیں لیکن تنقید اصول ہے جہاں مفاہمت کو دخل دینا ناسمجھی اور ناعاقبت اندیشی ہے۔ اوپر جو اقتباسات دیئے گئے ہیں وہ طرح طرح کی مفاہمت پر مبنی ہیں۔

اِس نوع کی تنقید پر ایک لطیفہ یاد آیا:۔

ایک مولوی صاحب نے کسی غیر مسلم کو مسلمان کرلیا۔ اس خیال سے کہ کہیں مُنحرف نہ ہوجائے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے۔ کہیں جاتے تو اسے پیچھے پیچھے چلنا پڑتا۔ مولوی صاحب عقائد اور اعمال کی مسلسل تلقین کرتے رہتے۔ نومسلم کو تاکید تھی کہ ہوں ہاں کرتا رہے تاکہ موصوف کو معلوم رہے کہ وہ متوجہ ہے۔ ایک مقام پر مولوی صاحب کو پسرو کی آواز نہ آئی۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک پیپل کے درخت کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا پایا۔ برافروختہ ہوکر جواب طلب کیا تو اس نے نہایت نرمی اور صلح جویانہ انداز سے عرض کیا کہ مولوی صاحب بگاڑ انہوں سے (ان سے بھی) اچھا نہیں۔

یہ بیانات اور مفروضات محل نظر ہیں۔ "شاعر اپنی قیمت آپ ہے" صحیح نہیں ہے۔ شاعری ہی نہیں کوئی انسانی فعل اپنی قیمت آپ نہیں ہے اگر وہ زندگی کو بہتر و برتر بنانے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ معین نہ ہو جیسا کہ اس سے پہلے کہا جاچکا ہے شاعری سماجی ذمہ داری ہے۔ کسی فرد واحد کے من کی موج یا ترنگ نہیں ہے۔ شاعری برائے شاعری اسی طرح فعلِ عبث ہے جس طرح شاعری برائے مقاصد مُشتبہ۔ مقاصد کے اعلیٰ یا ادنیٰ یا دوامی یا وقتی ہونے کی بنا پر شاعر اور اس کی شاعری کی سطح متعین کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے شکوۂ خسروی و تختِ کسریٰ سے مراد بجائے خود خسرو کا شکوہ اور کسریٰ کا تخت نہیں ہے بلکہ وہ اعلیٰ مقاصد اور اقدار ہیں جن کے حصول اور پیروی کی تحریک اقبال کے کلام میں ملتی ہے اعلیٰ شاعری ہمیشہ انسانی آفاقی اور دوامی ہوتی ہے اس لئے وہ ہر دور کے "دَرد و داغ اور سوز و ساز" کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اقبال نے ہم کو شکوۂ خسروی اور تختِ کسریٰ کی کوئی چیز دی ضرور ہے جس کو محسوس کر کے ہم پہلے سے اپنے کو مختلف اور ممتاز سمجھنے لگے ہیں نظیر اکبر آبادی کو میر۔ غالب اور اقبال کی صف میں نہ رکھا جائے تو نظیر

کی اپنی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوتی اور رکھا جائے تو ان کے قد و قامت میں مطلق کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ آخر یہ کیوں کہ جب تک کوئی شاعر میر، غالب اور اقبال سے منسلک نہ کیا جائے اُس کی قدر و قیمت متعین نہ ہو سکے۔

نظیر اکبر آبادی کا عوام کا مقبول و محترم ترین شاعر ہونا اُن کا سب سے بڑا انعام و امتیاز ہے آج ترقی پسند یا جدید شاعری کا کوئی شاعر اُن کا ہمسر نہیں ہے باوجود اس کے کہ یہ شاعری اس کا دعویٰ کرتی ہے کہ وہ عوام کے دل کی دھڑکن ہے۔ سادہ اور دھرتی سے قریب ہے۔ بول چال کے مطابق ہے۔ کنایاتی اور طنزیہ ہے خاص بے باک اور حقیقت نگار ہے۔ خطابت یا حکمت دونوں کو چھوڑ چکی ہے کبھی سرگوشی کے انداز میں بات کرتی ہے کبھی خود کلامی سے کام لیتی ہے کبھی دو یا تین لہجوں کو یکجا کرتی ہے۔ آدم کو آدابِ خداوندی سکھانے کے بجائے آدم کو اپنے ہی کو سمجھنے کے علاوہ آدم کو دوسروں سے سمجھ لینے کے بھی آداب سکھاتی ہے ایسے آدم کو اس نے تلاش کر لیا ہو یا نہیں جس کے پیچھے پانچ ہزار سال کی تہذیب کی تاریخ ہو اُس نے اس آدمی کو ضرور دریافت کر لیا ہے جب سے پہلے صرف جانور کی لمبی کہانی ہے۔

ترقی پسند یا جدید شاعری نے پچھلے ۳۰-۳۵ سال میں اُردو شاعری کا لہجہ و آہنگ ہی نہیں اس کے موضوع ہیئت اور خوب یا ناب کو جس طرح اور جس حد تک بدلا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ تبدیلی کہاں تک صرف تبدیلی ہے اور کہاں تک ترقی یافتہ اس سے اُردو نظم کی مقدار اور انواع میں اضافہ ہوا ہے لیکن معیار گرا ہے۔ میرا خیال ہے کہ خود ترقی پسند شاعری کے معیار سے اس شاعری کو پرکھا جائے تو بھی اس کو شاعری کا خاطر خواہ نمونہ نہ پائیں گے تاوقتیکہ معیار کا نہ ہونا ہی معیار ہو۔ شاعری کی ہیئت یا موضوع کچھ ہی کیوں نہ ہو گو

ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ فن۔ زبان۔ لہجہ۔ ماحول۔ روایات اور سامعین اور قارئین کی پسند و ناپسند کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے شاعری کرنی ہے تو شاعری کے آداب ملحوظ رکھنے پڑیں گے۔ ہفوات اور ہلڑ شاعری کی کوئی قسم نہیں ہے۔ رہا خواص پسند یا عوام پسند کا سوال تو میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اعلیٰ انسانی صفات اور عمل مثلاً سچائی، شجاعت نیکی۔ حمیّت۔ خوبصورتی کی طرح شاعری کو بھی نیچے کی طرف لانے کے بجائے بلند سے بلند تر اور خوب سے خوب تر کی طرف لے جانا چاہیئے اور اس کوشش میں عوام کو اپنے ساتھ لے چلنا چاہیئے اُن کے ساتھ نہ چلنا چاہیئے۔ ترقی پسند نظیر کو شاعری میں اپنا امام مانتے ہیں لیکن کیسی بوالعجبی ہے کہ نظیر کو بڑا بنانے اور بنالے کے لئے میر۔ غالبؔ۔ اور اقبالؔ کی صف میں جگہ نکالنا چاہتے ہیں۔

"دھرتی سے قریب ہو لے اور جن دوسری صفات کی تنقید نگار نے فہرست دی ہے غالباً وہ تمام کی تمام ترقی پسند یا جدید شاعری میں ملتی ہیں۔ دوسری طرف اقبالؔ کی شاعری اُن سے معرّا ہے۔ اِن حالات میں سوسائٹی اور شاعری کے وہ تقاضے کیوں نہیں پورے ہوتے جن کی علمبردار ترقی پسند یا جدید شاعری ہے۔ ان کو پورا کرنے کا تقاضا اقبالؔ کی شاعری سے کیوں کیا جاتا ہے۔ کیا ضرور ہے کہ کسی مقصد کے حصول کے لئے ہم اپنے طور طریقوں کے بجائے کسی دوسرے کا ٹکنک اور آہنگ اختیار کریں۔

خاص طور پر جب یہ معلوم ہو چکا ہو کہ وہ ٹکنک اور آہنگ یکسر ناکامیاب ہو چکا ہے اعلیٰ شاعری میں کاشتکاری کا اصول نہیں چلتا کہ زمین زید کی بیع عمر کے آلات کشاورزی بکر کے کھاد پانی خالد کا پیداوار کھلیان میں پہنچی تو چار سے تقسیم کر کے اپنا اپنا حصہ قبضہ میں لے لیا۔ سوال یہ ہے کہ نظیر کی کون کون سی خصوصیات کو ترقی پسندوں نے اپنا کر یا فروغ دے کر نظیر

کا نام روشن کیا۔ نظیر اور اقبال کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی تلقین مصلحت اندیشی کی بنا پر چاہے جیسی ہو ذوق اور ذہن کی رو سے قابلِ اعتنا نہیں۔

کالج میں تاریخ جغرافیہ کے لکچرار مُراد آباد کے قاضی جلال الدین صاحب تھے۔ بڑے مخلص۔ ذکی اور ظریف الطبع۔ اس زمانے میں لکچرار کی تنخواہ بہت قلیل تھی۔ قاضی صاحب نے اپنا ایک قصّہ سنایا۔ کہنے لگے وطن میں ایک بزرگ تھے جن کا سب لوگ بڑا احترام کرتے سب کے سامنے ایک دن سوال کر بیٹھے کیوں قاضی جی علی گڈھ کالج میں تم کو مشاہرہ کیا ملتا ہے۔ عرض کیا حضور اللہ دال دلیا کا انتظام کر دیتا ہے۔ میری اور ڈاکٹر ضیاء الدین کی تنخواہ مِل کر کوئی بارہ سو ماہوار ہو جاتے ہیں اس میں ڈاکٹر ضیاء الدین کے نام کو زیرلب اس روانی سے ادا کیا کہ کسی کو سنائی نہ دیا زور بارہ سو ماہوار پر رکھا۔ تمام لوگ مَرحبا مَرحبا کہنے لگے ــــ نظیر اکبر آبادی کو میر۔ غالب اور اقبال کے ساتھ وابستہ کرنے میں کچھ اس طرح کی مصلحت یا نقشہ نظر آتا ہے ــ کلاسیکس کو چراغ بتاتے ہیں جس سے دوسرے چراغ جلائے جاتے ہیں ساتھ ہی اس کو پیرتسمہ پا بھی قرار دیتے ہیں۔ ترقی پسند شعروادب نے کلاسکس سے نہ اپنا چراغ جلایا نہ اس کو پیرتسمہ بننے دیا لیکن نتیجہ کیا رہا۔ اس میں چاہے جتنی صلاحیتیں پیدا ہو گئی ہوں باقی رہنے اور کلاسک بننے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی۔ ترقی پسند شعروادب میں کچھ اور نہیں پچھلے ۳۵-۳۶ سال میں دو چار سو شاعر ضرور گذرے ہوں گے لیکن اب تک ان کی (RANKING) درجہ بندی نہ کی جا سکی یعنی اوّل۔ دوم، سوم درجے کے کون کون سے شعرا ہیں۔ شواہد نہ ہونے کے سبب سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ سب ایک ہی سطح کے ہیں یعنی ہر ایک اوّل درجہ کا ہے یا دوسرے تیسرے درجہ کا۔ اس سے تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند شاعر اور ادیب جب تک کلاسکس کے پیرتسمہ پا سے اپنی نسبت کا اظہار

نہیں کرتے خود اپنی نظر میں مُعتمد نہیں ٹھہرتے۔ نظیر کو میر۔ غالب اور اقبال سے وابستہ کرنے میں اور کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔

حالی اور اقبال جو ہمارے شعر و ادب کی مایۂ افتخار شخصیتیں ہیں اُن کے بارے میں اُردو کے یہ تنقید نگار کیا خیال رکھتے ہیں اس کا اندازہ متذکرہ صدر اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے۔ حالی اور اقبال کے رُتبے میں اس طرح کے بیانات سے کوئی فرق نہیں آتا۔ لیکن اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ زندگی جن کو شعر و ادب کا ذہن اور ضمیر ہونا چاہئے شعر و ادب اور اس کی برگزیدہ نمائندوں کی آبرو ریزی کس سفاکی سے کرتے ہیں۔ بذاتِ خود میں کچھ اس طرح خیال کرتا ہوں کہ جس طرح قرآن پاک کا معجزہ سیرتِ رسولؐ اسی طرح عشقِ رسولؐ کا معجزہ کلامِ اقبال ہے۔

اقبال اور غزل[۱]

۱؎ جدید غزل ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ۔ سرسید بک ڈپو علی گڑھ
اشاعت دوم ص ۹۳۰ تا ۱۰۰۳ ۔

اقبال کی ابتدائی غزلیں اور میرے خیال میں تو نظمیں بھی کچھ زیادہ قابلِ اعتنا نہیں ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب داغ کی زبان اور داغ کے کلام کی بڑی دھوم تھی۔ یہ دونوں باتیں اقبال کے لئے بڑی کشش رکھتی تھیں۔ اس لئے نہیں کہ اقبال آئندہ چل کر بڑے شاعر بننے والے تھے بلکہ اقبال نوجوان تھے — طبیعت شاعرانہ پائی تھی اور اُن کا دیار اُردو کی سحر کاریوں کی گرفت میں آچکا تھا۔ لیکن اقبال کسی طرح داغ کی منزل پر دیر تک نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ وہ جلد آگے بڑھ گئے اور اس تیزی سے آگے بڑھے کہ انہوں نے تمام عمر داغ کی طرف مڑ کر نہ دیکھا۔ داغ کی منزل پر ٹھہر جانا کسی شاعر کے لئے کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ اقبال نے دراصل داغ سے زبان نہیں سیکھی بلکہ شاعری میں زبان کی اہمیت پہچانی۔ شاعری کے لئے اُردو زبان اب اتنی پختہ اور آزمودہ ہو چکی ہے کہ کسی شاعر کا چاہے وہ کتنا ہی ہونہار کیوں نہ ہو زبان سے بے تکلفی برتنا یا اس کے تقاضوں کو خاطر میں نہ لانا خود اس کے حق میں مفید نہ ہوگا۔ اقبال کی غزل کی زبان اُردو کے دوسرے غزل گویوں کی زبان سے مختلف بھی ہے اور ناقابلِ تقلید بھی۔ اقبال کو اپنی غزل کے لئے نئے انداز کی زبان وضع کرنی پڑی — ایسی زبان کو غزل سے منوا لینا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ گو یہاں اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ غالب کے ہمراہ اس راستے کے بہت سے کانٹے نکل چکے تھے۔

اب ہمارے عام غزل گو شعراء خواہ وہ کسی مسلک یا مرتبہ کے ہوں کچھ اور نہیں تو وہ ایک آدھ شعر اقبال کے رنگ میں کہہ دینا ضروری سمجھنے لگے

ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ جب تک کوئی بات اقبال کے رنگ میں پیش نہ کی جائیگی اُن کا کلام یا وہ خود مقبول عام کی سند نہ پا سکیں گے۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ غزل میں اقبال کا رنگ بنانا اقبال کے علاوہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔

اقبال نے اپنی غزلوں میں ہم کو یہ محسوس کرایا کہ عشق و محبت دل ہی کا ماجرا نہیں ذہن کا بھی ہے۔ نئی غزل گوئی کا یہی سنگِ بنیاد ہے۔ غالب کے ہاں بھی دل و ذہن کا ماجرا ملتا ہے۔ لیکن غالب کو یہ سہولت حاصل تھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو کسی مخصوص مقصد یا نقطۂ نظر کا پابند نہیں رکھا تھا۔ وہ جو چاہتے تھے کہہ سکتے تھے۔ اقبال اپنے سامنے ایک مقدر رکھتے تھے جس سے وہ ہم کو آشنا کرانا چاہتے تھے۔ یہ مقدر تھا اسلامی عقائد کی برتری اور اسلامی اعمال کی برگزیدگی کا۔ اپنی شاعری میں اقبال نے اُنہیں دو پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ اقبال کی غزلوں میں اُن تمام شکوک کی توجیہہ مل جاتی ہے۔ جو اُن کے نظریوں کا نتیجہ بتائے جاتے ہیں۔ اقبال کے ہاں کوئی چیز مجرّد نہیں ہے۔ حُسن ہو۔ عقل ہو۔ عشق ہو۔ مذہب ہو، زندگی ہو۔ آدب ہو۔ وہ سب کو باہم دگر مربوط و مستحکم دیکھتے ہیں۔ جزو میں یہ علیحدہ علیحدہ رکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن کل میں یہ سب ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ بڑی شاعری میں منجملہ اور باتوں کے دو نہایت ضروری ہیں ایک تو اُس کا رشتہ کسی اعلیٰ اور عظیم حقیقت سے دوسرے اس کا ربط کسی اعلیٰ اور عظیم شخص اور شخصیت سے۔ علم تلاشِ حقیقت ہے۔ شاعری جستجوئے انسانیت۔ بڑی سے بڑی کوئی ایسی حقیقت نہیں ہے جو انسان کے لئے نہ ہو۔ اقبال خدا کو سب سے بڑی حقیقت تصوّر کرتے ہیں۔ اور رسالت مآبؐ کو سب سے بڑا شخص اور شخصیت۔ بڑی شاعری میں بڑے انسان کا ہونا لازمی ہے اور بڑا انسان سب سے بڑی حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔

اقبال کے فلسفہ کی بنیاد اسی مقدر پر ہے جس کا ذکر اوپر آیا ہے

اُنہوں نے اپنے عقیدے کی بنیاد فلسفہ پر نہیں رکھی ہے بلکہ اپنے عقیدے کو فلسفہ کا جامہ پہنایا ہے۔ اگر یہ جامہ عقیدہ کے جسم پر جہاں تہاں چُست نظر نہیں آتا تو اس سے اقبال کے عقیدے پر حرف نہیں آتا۔ عقیدہ یوں بھی فلسفہ کا دستِ نگر نہیں ہوتا۔ عقیدہ یقین ہے فلسفہ نہیں۔ یقین شخصی فلسفہ ہے ۔ اقبال عظمتِ آدم اور عظمتِ فرد دونوں کے داعی ہیں۔ اُن کے عقیدے کے مطابق ہر شخص (فرد) بے پایاں ترقی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ اسلامی عقیدہ اور عمل کا محور "کلمہ گیتی نورد" ہے اسی لئے اسلام کا تصوّر قومی نہیں ہے جو آج کل سمجھا جاتا ہے مختلف ٹولیوں میں رہنے سہنے کی انسان میں جو خواہش ہے وہ در اصل سلامتیٔ جان و مال کی بنا پر ہے تمدّن کے ابتدائی دور میں یہ خواہش مفید تھی لیکن ترقی یافتہ زمانے میں اس کے خطرات مسلّم ہیں جس کے نتائج آج ہر طرف ظاہر ہو رہے ہیں۔

اقبال کو کمیونلسٹ (فرقہ پرست) بتایا جاتا ہے جس دیار میں فرقہ پرستی عام ہو وہاں بڑی شاعری اور بڑے شاعر کا محور و مقصود ذہنوں میں نہیں آسکتا۔ اقبال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کے مُبلغ تھے بعد میں "مُسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کے داعی بن گئے۔ اس طرح کبھی وہ قوم پرست تھے بعد میں فرقہ پرست ہو گئے۔ لیکن تنقید نگار یہ نہیں دیکھتے کہ اقبال کی منزلِ مقصود کیا تھی اور اس کے طے کرنے میں وہ کہاں سے کہاں تک پہونچے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
میری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند

تو ابھی رہگذر میں ہے قیدِ مقام سے گذر
مصر و حجاز سے گذر پارس و شام سے گذر

نہ چینی و عربی نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

اقبال پر کمیونزم کا اتہام رکھنے والے ان اشعار میں اقبال کی فکر و نظر کا مطالعہ کریں۔ اقبال کی مانند بڑا شاعر کبھی فرقہ پرست نہیں ہو سکتا۔ ہمارے تنقید نگار اس نکتہ سے یقیناً باخبر ہوں گے کہ بڑی شاعری کی سرحدیں کمیونزم سے نہیں انسانیت سے ملی ہوتی ہیں — مذہب کا حقیقی تصوّر حیات و کائنات کا بڑا تصوّر ہے اور ہر بڑی شاعری کا سوتا کسی نہ کسی عظیم تصورِ حیات و کائنات سے پھوٹتا ہے۔ یہ عظیم تصوّر اسلامی بھی ہو سکتا ہے، عیسوی بھی اور ہندو بھی۔ ان معنوں میں اسلامی ادب ہندو ادب اور عیسائی ادب سب کا قائل ہوں۔ بڑی شاعری کا ماخذ یوں بھی بیشتر مذہبی یا ماورائی رہا ہے۔

کسی شاعر یا شاعری میں منطق۔ فلسفہ۔ ریاضی اور سائنس کا ربط ڈھونڈنا اور نہ پانا تعجب کی بات نہیں ہے۔ شاعری علم نہیں ہے۔ بلکہ شاعر کے فکر، تخیّل، تاثر یا تجربہ کا انفرادی جمالیاتی اظہار ہے جو مختلف حالات میں مختلف ہوتا ہے ان میں منطقی ربط نہ ہونا عیب نہیں۔ قرینِ فطرت ہے۔ شاعر انسان زیادہ رہتا ہے منطقی کم — اقبال کے مردِ مومن کا مولا صفت ہونا اُن کے نظریۂ خودی کے عین مطابق ہے۔

اقبال کو سمجھنے کے لئے یہ بات ذہن میں رکھنی پڑے گی کہ انھوں نے زمانہ انیسا پایا تھا جب سائنس۔ ادب۔ فلسفہ۔ مذہب۔ قومیت۔ تجارت

سیاست، سرمایہ داری سب کی سب زندگی کی نئی تقدیر سے دست گریباں تھے اور کتنے سفینے اور ساحل اس کی زد میں آکر پاش پاش ہو رہے تھے۔ اقبال صرف شاعر نہ تھے مُفکر بھی تھے۔ مسلمان بھی۔ مجاہد اور مُعلم بھی ـــ اُن کی شاعری میں ان تمام صفات کی جلوہ گری ملتی ہے تو کیا تعجب ــ ظاہر بین نظروں کو اقبال کے یہاں تضاد ملتا ہے لیکن اقبال مسائلِ حیات کا حل خانوں میں نہیں تلاش کرتے تھے بلکہ ایک گیتی نور و عقیدۂ رحمت و منزلت میں سوچتے تھے ـــ اقبال سے پہلے کوئی ایسا شاعر نہیں گزرا تھا جس نے قوموں کی تقدیر اور انسانیت کے تقاضوں کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہو جتنا کہ اقبال نے ـــ اقبال ہمارے تمام شعراء سے زیادہ لکھے پڑھے تھے اُن کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ علوم و فنون ہی کا نہیں ــ یزدان۔ انسان اور اہرمن سب ہی کا۔ ان کے نظر میں وہ تمام تہلکے اور تحریکیں تھیں جن سے زندگی دوچار تھی اور انسانیت معرضِ خطر میں ــ ایسے وقت میں یا تو پیغمبر پیدا ہوتے ہیں یا شاعر۔ ہندوستان میں دونوں پیدا ہوئے گاندھی اور اقبال۔

اقبال کی شاعری اور اُن کے افکار کے سمت و رفتار کے مطالعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال نے فن کے رموز۔ زبان کی اہمیت اور شاعری میں فکر، جذبہ اور تخیل کے مقامات پہچاننے میں کتنا ریاض کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعری نے اقبال کو اقبال بنانے میں اپنی ساری آزمائشیں ختم کر دی ہوں اور ان کے بعد ان پر اپنی ساری نعمتیں بھی تمام کر دی ہوں جیسے اردو شاعری کا دین اقبال پر مکمل ہو گیا ہو۔

اقبال کی نظموں میں غزل کی اور غزل میں نظموں کی خوبی اور خوشنمائی ملتی ہے نظم کا زور اور غزل کی زیبائی۔ اقبال نے بڑی محنت، تلاش۔ تجربہ اور تراش خراش کے بعد اپنی غزل کے لئے ساز اور سانچے بنائے۔ یہ ساز اور یہ سانچے کسی دوسرے غزل گو کے بس کے نہیں۔ غالب کے بعد اقبال

نے اردو شاعری کو فارسی سے ایک نئی محکمی بخشی اور فارسی کی فتوحات ہیں ایک قابل قدر اضافہ۔

اقبالؔ کی غزلوں میں وہ باتیں نہیں ملتیں جو اردو غزل میں بہت مقبول تھیں مثلاً رشک و رقابت۔ فراق و وصال۔ جسم و جمال کا ذکر صنائع و بدائع اور زبان و بیان کی نمائش جن کے بغیر غزل غزل نہیں سمجھی جاتی تھی اور جن کو ہمارے بیشتر شعرا اپنا اور اپنے کلام کا بڑا امتیاز سمجھتے تھے اقبالؔ نے اپنی غزلوں میں عام غزل کو شعرا کی نہ زبان رکھی نہ موضوع۔ نہ لہجہ بلکہ ایسی زبان، موضوع اور لہجہ اختیار کیا جن کا غزل سے ایسا کوئی رشتہ نہ تھا۔ اس کے باوجود ان کی غزلوں میں تنوّع۔ تاثیر۔ شیرینی شائستگی نزاکت و نغمگی کے علاوہ جو اچھی غزل کے لوازم ہیں وہ فرد و فرزانگی اور قاہری اور دلبری ملتی ہے جو مناظرِ فطرت اور صحفِ سماوی میں ملتی ہیں۔

اقبالؔ کی غزلوں کے سامنے ہم بے ادب یا بے تکلّف ہونے کی جرات نہیں کر سکتے۔ اقبالؔ نے غزل کی بزمیہ کو رزمیہ کے درجے پر پہنچا دیا انہوں نے غزل کو محفلِ سماع اور بزمِ ماتم سے نکال کر مجاہدوں کی صف اور دانشوروں کے حلقے میں پہونچا دیا۔ اقبالؔ کی نظموں کا شباب، اقبالؔ کی غزلوں کی شراب میں ڈوبا ہوا ہے۔ عشق نے جامیؔ سے جب تک "ترکِ نسب" نہیں کرالیا اپنی حریم میں داخل نہیں ہونے دیا۔ یہی حال غزل کا ہے۔ جب تک اس نے اقبالؔ سے ترکِ نسب نہیں کرالیا اپنی بارگاہ میں آنے کی اجازت نہیں دی۔ غزل صرف اپنے نسب کا احترام کرتی ہے کافر آفاق میں گم ہوتا ہے۔ مومن میں آفاق گم ہوتا ہے۔ اقبالؔ کو غزل میں گم ہونا پڑا۔

بیسویں صدی میں شاعر نے مشرق کی پیغمبری۔ اقبالؔ اور ٹیگور کو تفویض کی اور مشرق کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اس کا حق اس

خوبی ۔ خلوص اور خوبصورتی سے ادا کیا ہو جتنا کہ ان دونوں نے ۔ جہاں تک اُردو شاعری کا تعلق ہے کم از کم اس صدی کے بقیہ نصف میں شاید اقبال سے بڑا شاعر پیدا نہ ہو ۔ البتہ اقبال کے تصرّف سے یک سے ایک ممتاز شاعر پیدا ہوتے رہیں گے ۔ بڑی شاعری اور بڑے شاعر کی یہ کھلی ہوئی نشانی ہے ۔

(جدید غزل، میں علامہ اقبال پر تفصیلی مضمون کے علاوہ
منقرق اقتباسات ملتے ہیں۔ انھیں یہاں یکجا کر دیا گیا ہے)

اقبال نے غزل کو دفعتاً اس بلندی پر پہنچا دیا جہاں موجودہ عہد کے شعراء کی غزل گوئی پہنچتی نہیں معلوم ہوتی۔ ان کی کم و بیش تین نسلیں ہمارے سامنے ہیں لیکن ان میں غیر معمولی ترقی کے کوئی اُمید افزا آثار نہیں ملتے۔ اس طور پر یہ کہنا حقیقت سے دور نہیں کہ ایک نامعلوم مدّت تک غزل ہی نہیں بلکہ اُردو شاعری کے جملہ اصناف کا اعتبار و امتیاز اقبال کے دیئے ہوئے معیار سے متعین ہوگا۔ اس کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ غزل کو اقبال کے دکھائے بتائے ہوئے راستے پر چلانا ضروری ہے۔ غزل کی سطح لب و لہجہ۔ اندازِ بیان۔ مضامین ہمیشہ مُتنوع و مختلف رہیں گے۔ غزل کی اس میں جیت ہے۔ یہی سبب ہے کہ میر و غالب اور حالی کی غزل گوئی کے بعد سامعین اور قارئین غزل کے باب میں برابر چوکنے رہے ہیں کہ اس میں بازی گری اور بد ذوقی راہ نہ پائے کسی اور صنفِ سخن پر اُردو والوں کا اتنا سخت اور متواتر احتساب نہیں رہا ہے جتنا کہ غزل پر۔ یہ اسی نگہداشت کا تصرّف ہے کہ غزل میں کہنگی راہ نہ پا سکی جس صنفِ سخن پر اُردو سماج کی ایسی کڑی نظر ہو وہ اور اس کے شاعر کبھی معیار سے پست نہیں ہو سکتے۔ یہ معیار ہمیشہ اونچا ہوتا رہے گا۔ غزل کی ہیئت پر اعتراض ہوتے رہیں گے لیکن غزل کی وقعت کو اقبال نے ہمیشہ کے لئے مُسلّم کر دیا۔

. . . . . اثر آفرینی کے لئے اقبال نے اپنے نوع بہ نوع کلام میں جہاں اور بہت باتوں کا التزام رکھا ہے وہاں غزل کے اس مطالبے کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے کہ مضمون خواہ کسی نوعیت کا ہو اور صنفِ سخن

مختصر ہو یا طویل بھرتی کا کوئی شعر نہ داخل ہونے پائے۔ اقبال کے کلام کی مقبولیت میں اِس التزام کا بڑا حصّہ ہے۔ . . . . . .

اس صدی میں اقبال سے بڑا شاعر اردو میں نہیں پیدا ہوا۔ ان کے کلام سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہی ایک ایسے شاعر تھے جو اصلی معنوں میں کوئی رزمیہ لکھ سکتے تھے۔ اُن کے عہد میں دنیا میں کیا کچھ نہیں پیش آیا اور انھوں نے دور یا قریب سے کیا کچھ نہ دیکھا یا سنا۔ لیکن انھوں نے کوئی رزمیہ نہ لکھی گو ان کی اکثر نظموں میں رزمیہ کی نمایاں جھلک ملتی ہے۔ جتنے حادثے اقبال کے سامنے اور اُن کے زمانہ میں پیش آئے اُن میں ایک بھی پہلے زمانہ میں پیش آتا تو شاید اقبال سے کم درجہ کا کوئی شاعر کوئی رزمیہ لکھ ڈالتا۔ دوسری طرف اقبال نے باوجود اتنے بڑے شاعر اور حکیم ہونے کے بڑے سے بڑے سانحات پر صرف مختصر رزم پارے لکھنے پر اکتفا کی۔ افسانہ اور ناول میں جو درجہ مختصر افسانوں کا ہے اُس سے زیادہ مشکل و معتبر رزمیہ میں اقبال کے ان رزم پاروں کا ہے۔

. . . . . اقبال نے کہا ہے "بر عناصرِ حکمراں بودن خوش است" تصوّف کی تعبیر کرنے میں ایک وقت اقبال بہت متعون ہوئے تھے۔ انھوں نے رجوع بھی کر لیا تھا لیکن اس کا انتقام انھوں نے اس طرح لیا کہ "بر تصوّف حکمراں بودن خوش است" کا اعلان کر دیا اور شاعری میں اس اصول کو اپنے کلام سے ایسی منزلت دیدی کہ دوسرے درجے کے شعراء کا وہاں تک پہونچنا ممکن نہیں رہا۔

. . . . . اقبال کے بارے میں کہنا کہ مذہبی۔ اخلاقی اور سماجی موضوعات پر وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ بندھے ٹکے انداز کی نہیں ہوتی۔ اقبال جو کچھ جس طرح کہتے ہیں۔ اسی میں غیر معمولی تازگی۔ توانائی۔ تاثر اور حسن ملتا ہے یہ اقبال کا مخصوص دبستان بن گیا ہے۔ ایسا دبستان جس کے خالق اور خاتم وہی معلوم ہوتے ہیں۔

حالانکہ انہی موضوعات پر کہنے کے لئے بے شمار سانچے اُردو میں موجود ہیں جن کو شعرا بے تکلّف کام میں لاتے ہیں۔ یہ اس لئے کہنا پڑ رہا ہے کہ قدیم وجدید اساتذہ کی تقلید میں کہنے والوں کی ہمارے یہاں کمی نہیں ہے اور یہ تقلید کچھ اتنی زیادہ کھٹکتی بھی نہیں لیکن اقبال کے انداز و آہنگ میں کہنے والا اب تک وہ امتیاز حاصل نہیں کر سکا ہے جس کا وہ متمنی ہوتا ہے یا جس کے ہم منتظر ہیں ۔ اقبال کے رنگ میں یا اقبال کی سطح سے قریب ہو کر کچھ کہہ لینا بڑا مشکل کام ہے۔

. . . . . بڑی شاعری شاعر کا انفرادی لازوال کارنامہ ہوتا ہے برخلاف سائنس کے کارناموں کے جو مشترکہ محنت و تحقیقات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ایٹم بنانے میں معلوم نہیں کتنے سائنس داں اور سائنس کے کارپرداز برسرِ کار رہے ہوں گے۔ لیکن اقبال کی نظم تنہائی مسجد قرطبہ اور ساقی نامہ صرف اقبال کے کارنامے ہیں۔ میرا مقصد یہاں سائنس کی اہمیت و عظمت سے انکار نہیں ہے۔ شاعر کی انفرادیت اور اُس کے منصب کا جتانا ہے . . . . .

. . . . . جدید غزل تصوف سے تقریباً خالی ہو چکی ہے روایتی تصوّف پر اقبال نے بڑی کاری ضرب لگائی اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آئندہ شاعری میں تصوّف کی کارفرمائی نہ رہے گی۔ یوں بھی اورنگ زیب کے عہد میں تصوف کا بازار مندا رہتا ہے۔

تہذیب اور تاریخ کا پورا سوادِ اعظم حالی نے اپنی آنکھوں کے سامنے مسمار ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے کھنڈر پر حالی بے پایاں انسانی دردمندی اور غیرتِ قومی کے ساتھ کھڑے اپنے ساتھیوں کی غفلت اور خفیف الحرکاتی پر آنسو بہاتے ہیں۔ سوادِ رومۃ الکبریٰ میں اقبال۔ حالی ہی کی آوازِ بازگشت ہیں۔ شاعری کا اتنا بڑا کینوس حالی اور اقبال ہی کے بس

کا تھا۔ ہر بڑی تہذیب کے کھنڈر پر کوئی نہ کوئی حالی یا اقبال ضرور نمودار ہوتا ہے۔ اگر نہ ہو تو وہ تہذیب بے ترکہ ہے جس کی تاریخ کے اوراق اور اقوام کی تقدیر میں کوئی وقعت نہیں۔ بڑے شاعروں کی شاعری میں تاریخی تہلکے انسانی تہذیب میں ڈھلتے ہیں۔ شاعری خوانچہ والوں کی پکار نہیں ہوتی۔ انسانیت کے خاصانِ بارگاہ کی فغانِ نیم شبی اور گریۂ سحری ہوتی ہے۔ حالی اور اقبال کی شاعری اس پایہ کی ہے ——

..... انہوں نے ہمیشہ غزل کو اپنے قابو میں رکھا اور یہ بات معمولی نہیں ہے۔ جس شاعر پر فن یا موضوع قبضہ پالے میں اُسے بڑا شاعر نہیں سمجھتا۔ بڑا شاعر وہ ہے جو فن اور موضوع کو اپنے قبضہ میں رکھے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک خود کو اپنے قابو میں نہ رکھ سکے۔

..... شاعری اور شاعر کا کمال یہ ہے کہ فرزانے دیوانے بننا چاہتے ہیں اور دیوانے فرزانگی کی طرف مائل ہوں۔ اِس اعتبار سے کلامِ اقبال کی بلندی تک پہونچنا ایک طویل نامعلوم مُدّت تک ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

شاعرِ مشرق

اور

مسجدِ قرطبہ[۱]

پیغمبری کرد

[۱] از علی گڈھ کی مسجدِ قرطبہ ص۱۰ تا ۱۲

خُدا کے حضور میں اُس کے بندوں کے سجدے ہر چپہ زمین کو مسجد اور ہر مسجد کو مسجدِ قرطبہ بنا دیتے ہیں۔ قرطبہ کی مسجد کی وہی حیثیت تھی جو دنیا کی کسی مسجد کی ہو سکتی ہے جس کی بنا تقویٰ پر رکھی گئی ہو۔ لیکن مسجد کی عظیم معنویت کو پہچاننے اور پہچوانے کے لئے رسولِ اکرمؐ کے بعد اللہ تعالیٰ نے کسی افلاطونِ عہد۔ صاحبِ سریرِ سلطنت یا اربابِ شریعت و طریقت کا نہیں بلکہ اُردو کے ایک شاعر اقبالؔ کا انتخاب کیا۔ جس نے پیغمبری کی لیکن جسے پیغمبر نہیں کہہ سکتے۔ کلامِ پاک اور حدیث شریف کے بعد برِصغیر کے مسلمانوں کو سچا اور اچھا مسلمان بنانے میں اقبالؔ کی شاعری کا جو حصہ ہے وہ شاید ہی کسی اور ملک اور زبان کی شاعری کو نصیب ہوا ہو۔ دین کے احیاء یا دین کی اصلاح کی تحریکیں ہر قوم اور ملک میں ہوئی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ اسلام میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ لیکن ایسا کم دیکھنے میں آیا ہوگا کہ شاعری کو وسیلۂ اظہار و ابلاغ بنا کر کسی شاعر نے ایک سب سے نئی اور نوعمر زبان سے یہ کام لینے میں ایسی حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہو جتنی کہ اقبالؔ نے۔

میرا تو کچھ اس طرح کا اور یہاں تک خیال ہے کہ جو باتیں مسلمانوں کے ذوق اور ذہن کو بالیدہ اور بلند کر سکتی ہیں اور کرتی آئی ہیں بشرطیکہ وہ قوم زندگی کے فساد و فشار کو زندگی ہی کے اعلیٰ اقدار کی میزان میں رکھ کر ڈنڈی مارنے کے بجائے ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولنے کا حوصلہ کر سکتی ہو۔

اقبالؔ کو ایک عزیز نے فرطِ عقیدت سے شاعرِ آخر الزماں کہہ دیا آخر الزماں ہونے کا تصور تو مسلمانوں کے نزدیک ظہورِ قدسی پر ختم ہو گیا۔

البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کے بعد ایسا "دانائے رازِ آید کہ نہ آید" سے معلوم نہیں کتنے دنوں تک نسلاً بعد نسلاً کتنے بے شمار لوگوں نے مسجدِ قرطبہ کو دیکھا ہوگا اور اس میں فریضۂ نماز ادا کیا ہوگا۔ لیکن مردِ مومن کے سجدے یا مسجد کی بازیافت صرف اقبال نے مسجدِ قرطبہ میں کی۔ اس نظم کو جسے اردو نظموں کی مسجدِ قرطبہ کہیں تو بے محل نہ ہوگا۔ پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہونے لگتا ہے۔ جیسے نماز کی منزلت کو جس قدر اور جس طرح اقبال نے مسجدِ قرطبہ کی تعبیر سے مُسلم و متعین کیا۔ آج تک شاید ہی کسی اور نے کسی آثارِ عظیم کا باسنشناءٔ روضۂ اقدس اور خانۂ کعبہ کیا ہوگا۔ کبھی کبھی تو یہاں تک گمان ہونے لگتا ہے کہ روزِ اول ابلیس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کرکے جس طرح جلالتِ الٰہی کو معرضِ بحث میں لانے کا اقدام کیا۔ اقبال نے مسجدِ قرطبہ میں مردِ مومن کے سجدے کی عظمت کی تعبیر کر کے اُس کی تلافی کردی ہو۔ ساتھ ہی خیال آتا ہے کہ مسلمانوں کے عہدِ رفتہ کی بازیافت یا تشکیلِ نو کا امکان کتنا بڑھ جاتا۔ اگر اقبال کے مرتبہ کے کسی شاعر یا سرسید جیسے زعیم کا ظہور زوال آمادہ اور مآل سے بے خبر ممالکِ اسلامیہ میں ہوتا اور ظاہر ہے جہاں یہ دو ہوں گے وہاں لیگ علی گڈھ بھی ہوگا۔

مسجد سے باہر آئے۔ سب اپنی راہ ہولئے اور اللہ کی بارگاہ اور انسانی معاشرے کا سنگم منقسم ہو کر مختلف دھاروں میں بہنے لگا۔

یہ کونسا رابطہ یا رشتہ تھا جس نے چشم زدن میں ہر اُس تفریق کو مٹا دیا جس کے آشوب سے انسانیت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تہ و بالا ہے جسے دنیا کی کوئی حکومت یا حکمت دور کر سکی ہے نہ کم۔ یہ یک جہتی اور یگانگت تو صرف خدا کے حضور میں نصیب ہو سکتی ہے جس کی بڑائی کے سامنے نہ کسی اور کی بڑائی کے کوئی معنی ہیں نہ کسی چھوٹائی کا کوئی مفہوم۔ موت سب کو مٹا کر ہم سطح کرتی ہے نماز سب کو متحد کر کے ہم سطح کرتی ہے۔ لاریب اسلام میں اللہ اور رسولؐ نظریہ نہیں ہیں نظیر ہیں۔

اقبالؔ اور غالبؔ[1]

[1] خطبۂ صدارت "غالب کی شخصیت اور شاعری"، دہلی یونیورسٹی سنہ ۱۹۶۹ء

کسی شاعر اور اُس کی شاعری کے حُسن اور افادے کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ ہر طرح کے لوگ ہر طرح کے موقعوں پر کس بے ساختگی اور کثرت سے اُس کے اقوال کو معرضِ گفتار میں لاتے ہیں۔ ضرب الامثال اسی طرح بنتے ہیں اور پھر نہیں مٹتے۔ چنانچہ بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ عام طور پر جتنے اشعار۔ مصرعے۔ فقرے اور تراکیب اقبالؔ اور غالبؔ کے کلام سے ہماری تحریر و تقریر میں بے اختیار آتے ہیں وہ کسی دوسرے اُردو شاعر کے نہیں آتے۔ اقبالؔ و غالبؔ یا غالبؔ و اقبالؔ کے بعد میرؔ ہیں۔ اس کے بعد بقیہ اور کسی شاعر کے اشعار یا مصرع ضرب الامثال کے طور پر زبان پر رواں ہوتے ہیں۔ اس کا دار و مدار اس پر ہے کہ سوسائٹی پر کس طرح کے شاعر اور شاعری کی گرفت ہے۔ ایک زمانہ میں داغؔ اور امیرؔ اور ان کے قبیلے کے شاعروں کے کلام سے سوسائٹی متاثر تھی۔ اس لئے ان کے اشعار اور مصرع زبان پر آتے تھے۔ اس کے بعد معاشرے کا مذاق بدلا اور بلند ہوا تو غالبؔ و اقبالؔ کو قبولِ عام نصیب ہوا۔ غالبؔ اور اقبالؔ کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اُردو سماج پر ان کی گرفت بڑھتی رہے گی۔ اور نامعلوم مُدّت تک باقی رہے گی۔ اس لئے کہ بہ حیثیت مجموعی اُردو شعر و ادب کا معیار کافی بلند ہو چکا ہے اور اس کے بلند ہونے کا مزید مدار اس پر ہے کہ اُردو میں غالبؔ اور اقبالؔ سے بڑا شاعر کب پیدا ہوتا ہے۔ مستقبلِ قریب میں تو نظر نہیں آتا۔

کسی شاعر کے شعر۔ مصرع۔ یا فقرے کا ضرب المثل کی حیثیت

اختیار کر لینا اُس کے معاشرے کے ہر چھوٹے بڑے کی طرف سے اُس کے لئے بڑی گرانقدر تحسین ہے جس کا حاصل کر لینا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ غالب۔ حالی۔ اور اقبال نے ہمارے ذوق اور ذہن کو اُردو شاعری سے ایک نئی وابستگی اور اس کا نیا انشراح بخشا ان سے ہم کو نیا عہد نامہ ملا ہے۔ اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ہماری شاعری کا معیار برابر اونچا ہوتا رہے گا۔ پست کبھی نہ ہوگا۔ شاعری ہی کا نہیں رزم و بزم کا بھی غالب کے یہاں خدا۔ شاعر، شراب اور وہ خود ہیں۔ عورت نہیں اقبال کے یہاں ایک اور چیز بھی ہے یعنی تصوّرِ ابلیس۔ جس کا ذکر یا عمل دخل ہماری شاعری میں رسمی اور روایتی رہا ہے یعنی مسلسل اور آنکھ بند کر کے اُس پر لعنت بھیجتے رہنا۔ اقبال نے شیطان کو قابلِ لعنت نہیں قابلِ لحاظ بنایا۔ اُردو شاعری میں اقبال پہلے شاعر ہیں جس نے انسان اور شیطان کو اس زاویے اور سطح سے پیش کیا جو مصالح خداوندی اور عظمتِ انسان سے قریب و قرین تھا۔ اقبال نے خدا۔ عورت۔ انسان اور شیطان کو اُردو شاعری سے جس طرح متعارف کیا اس سے ہمارے ادب۔ ہماری زندگی اور ہمارے سوچنے اور محسوس کرنے میں بڑا اں گراں قدر انقلاب آیا۔ اس دنیا میں خدا کی نیابت جس طرح انسان نے کی ہے یا اس کو کرنا چاہئے تھا اور جو اصل منشاءِ الٰہی اور تخلیقِ آدم تھا نیز انسان کی وکالت خدا کے حضور میں جس شایانِ شان طریقے اور لب و لہجے سے اقبال نے کی وہ ان کا بڑا کارنامہ ہے جس میں اقبال نے انسان کی فکر و نظر کو ایک نئی وسعت اور اُردو شعر و ادب کو ایک نئی وقعت۔ ذمہ داری اور روایت بخشی۔ اردو شاعری میں اقبال کے کلام نے وہ کیا جو کسی اُمّت میں صحیفۂ آسمانی کے نزول سے دیکھنے میں آیا ہے۔ اُن کا کلام اُردو شاعری کے معیار کو کبھی گرنے نہ دیگا اُردو شاعری میں چاہے جتنے انقلاب آئیں معیار وہی طلب کیا جائیگا

جو اقبالؔ کے کلام نے قائم کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عورت کا تصوّر حالی اور اقبالؔ نے عفّت۔ عزت اور عظمت کی جس سطح سے پیش کیا ہے وہ کسی دوسرے اُردو یا فارسی شاعر کے حصّے میں نہیں آیا۔ غالبؔ حالیؔ اور اقبالؔ کے بارے میں جو باتیں عرض کی گئی ہیں۔ ان کو ذہن میں رکھ کر آج کل کی اُردو شاعری اور ادب پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے شعر و ادب کو کہاں سے کہاں لئے جا رہے ہیں اور انھوں نے نئے ذہن کی کیسی رہبری یا قیادت کی ہے۔

غالبؔ کے کلام کا مطالعہ اِس حقیقت کو ملحوظ رکھ کر کرنا چاہئے کہ ہر پیمبر جو کسی قوم میں بھیجا جاتا ہے وہ اپنے سے پہلے کی شریعت کا بڑی حد تک ناسخ ہوتا ہے اور آئندہ شریعت کا بانی یا بشارت دینے والا۔ شعر و ادب میں یہ کارنامے غالبؔ کی طرح صرف چند منتخب اور عالی مقام شعراء نے انجام دیئے ہیں۔ غالبؔ نے اردو شاعری کو ایک نیا نسب ہی نہیں دیا بلکہ اس کو ایک نئی شریعت کی بشارت بھی دی ــــ غالبؔ کے کلام کا غور سے مطالعہ کریں تو محسوس ہوگا کہ شاعری کی پچھلی شریعت بڑی حد تک منسوخ کی جا چکی ہے اور اقبالؔ کی آمد کی "

"اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی"

ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

بامن میاویز اے پدر۔ فرزندِ آزر را نگر
آنکس کہ شُد صاحب نظر۔ دینِ بزرگاں خوش نکرد

آئینِ برہمن بنہایت رسانده ایم
غالبؔ بیا کہ شیوۂ آزر کنیم طرح

فرزند زیرِ تیغِ پدر می نہد گلو
گر خود پدر در آتشِ نمرود میرود

زآفرینش عالم غرض جز آدم نیست
بگردِ نقطۂ مادو رِ ہفت پرکار است

زما گرم است ایں ہنگامۂ ینگر شورِ ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکی کہ انساں شد

زخونیکہ در کربلا شد سبیل — آدارد دامِ زمانِ خلیل

ہرکجا ہنگامۂ عالم بود — رحمت اللعالمینے ہم بود

آں راز کہ در سینہ نہانست . نہ وعظ است

بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

ماضی کا لحاظ رکھنے میں غالبؔ اور اقبالؔ کا لہجہ کتنا ملتا جلتا ہے

ہر زہ شتاب وپیِ جادہ شناساں بردار

ایکہ در راہِ سخن چونتو ہزار آمد و رفت

نقشِ پے رفتگان جادہ بود در جہاں

ہر کہ رود بایدش پاسِ قدم داشتن

اس میں[۱] شک نہیں اگر غالبؔ نے اردو میں شاعری نہ کی ہوتی تو شاید ہم اِس احترام و عقیدت کے ساتھ اُن کی فارسی شاعری کی طرف متوجہ نہ ہوتے جتنے کہ ہوئے۔ غالبؔ اور اقبالؔ نے اردو کو فارسی سے اس طرح ہم آہنگ کیا اور ربط دیا ہے کہ اُردو میں جب کوئی بڑا شاعر کسی بڑے موضوع پر سوچنے اور کہنے کے لئے آمادہ ہوگا تو اس کو توانائی، زیبائی اور اثر آفرینی کے لئے فارسی کے نوع بہ نوع ذخائر سے استفادہ کرنا پڑے گا۔ عظیم زبانوں[۲] کے کارواں کے ساتھ اُردو شعر و ادب اب ناسخؔ اور انشاؔ کے بنائے ہوئے پالنے یا پالکی میں نہیں بلکہ غالبؔ اور اقبالؔ کی قیادت ورفاقت میں سرگرم سفر ہوگا۔ انگریزی کے کسی ادیب یا دانشور غالباً ای۔ ایم فارسٹر کا قول ہے کہ روزِ حشر حضورِ باری تعالیٰ میں یورپی تہذیب کی نمائندگی یا جواب دہی کے فریضے کو ادا کرنے کا مسئلہ اٹھا تو ہم بلا تکلف شیکسپیئر اور گوئٹے کا نام پیش کرینگے اس آزمائش سے ہم آپ دوچار ہوں تو شاید اتنے ہی وثوق سے غالبؔ و اقبالؔ اور ٹیگور کا نام لیں گے۔ اُن کے کلام کے آئینہ خانے میں ہماری تہذیب

---

[۱] ص ۲۱ تا ۲۲ خطبۂ اول [۲] ص ۴۹ تا ۵۱ خطبۂ دوم

کی پوری جلوہ گری ملتی ہے۔ تہذیب کا اعتبار ان اقدار سے متعین ہوتا ہے جن کی وہ نمائندگی کرتی ہے اور اقدار کا سرچشمہ ذہن انسانی کا وہ شعور ہے جو ذات و کائنات کے عرفان سے عبارت ہے۔ ذہن فرد کا ہوتا ہے اور وہی وسیلہ ہے کائنات اور انسان کے ادراک کا۔ چونکہ زمانی و مکانی اعتبار سے انسان کی حیثیت مخصوص و محدود ہے اس لئے اس کے ادراک و علم کی بھی حیثیت اضافی ہے مطلق نہیں۔ مطلق علم اصلاً صرف اُس ہستی کو حاصل ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے جو زمان و مکان کے قیود سے باہر اور بلند اور جسے ہر امکانی قوت و قدرت پر دسترس ہو اس کے باوجود انسانی ذہن کی نفسی کیفیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مطابق کے تصور کی مدد سے کائنات اور اشیا کی غایت کیفیت اور عمل کی تفہیم و تعبیر کی آرزو رکھتا ہے۔ درحقیقت مُطلق کے تصوّر کے بغیر انسانی فکر کا نہ کوئی مقصد رہ جاتا ہے نہ محور۔ ایسی صورت میں فکرِ انسانی کا وظیفہ صرف معلومات فراہم کرنے کے مترادف ہوگا۔ وہ صرف یہ معلوم کر سکے گی کہ یہ سب کیسے ہے۔ ایک حد تک شاید یہ بھی کہ یہ سب کیا ہے۔ لیکن انسانی ذہن یہ دریافت کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ یہ سب کیوں ہے۔ اس عظیم و حسین اِستفہام کو غالب نے کس سادگی و پرکاری سے پیش کیا ہے ؎

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکن زلفِ عنبری کیوں ہے — نگہ چشم سرما سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

اِستفہام کے اس جمالی پہلو کے ساتھ ساتھ اس کا جلالی پہلو وہ عظیم انحراف ہے جس کے مرتکب "خواجۂ اہلِ فراق" قرار پائے ہیں۔ جن کا ذکرِ خیر اقبال کے ہاں جا بجا ملتا ہے۔ ہر بڑے شاعر میں اِس اِنحراف کا پایا جانا ضروری

ہے۔ کیا عجب روزِ ازل انکارِ ابلیس کی صدائے بازگشت ہر بڑے شاعر کی روح میں جاگزیں ہو۔ مشیّتِ الٰہی بھی شاید یہی رہی ہو۔

مذہب۔ آرٹ۔ ادب اور فلسفہ اسی "کیوں" کی شمع کو اپنے اپنے فانوس میں گردش دیتے رہتے ہیں۔ "کیوں" کا مسئلہ آدم کی گندم چیشی کی یاداش ہے یا انعام۔ یہ بتانا مشکل ہے لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جستجو ادب میں مسائل اور معنی آفرینی سے عبارت ہے جو وجودِ انسانی کے لامتناہی غیر منقطع اور کثیر الانواع مشاہدات۔ تجربات۔ احساسات اور آرزوؤں کا احاطہ کرنے اور اس کی گرفت میں لانے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ جستجو خارجی حقائق یعنی اشیاء کائنات بشمول زماں و مکاں سے بھی تعلق رکھتی ہے اور داخلی اصول سے جو غیر مرئی محدود اور جبلّت انسانی سے متعلق ہوتے ہیں ان کے اجتناب اظہار و ابلاغ سے بھی۔ اقبال نے اس تمام انسانی تگ و تاز کو اپنی مشہور نظم "جبریل و ابلیس" کے اس مشہور مصرع میں بیان کر دیا ہے ؎

"سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو"

"اقبال[1] اور غالب ہمارے وہ یگانۂ روزگار شعرا ہیں جنھوں نے اردو زبان اور اردو شاعری کا حسب و نسب بلند کیا۔ غالب نے فارسی کے سہارے اردو کے نسب کو ولی اور ان کے چند پیشروؤں سے آگے بڑھا کر رودکی سے ملا دیا۔ اس فارسی کے سہارے جو صدیوں پہلے سے ہندوستان کی فضا میں تشو و نما پا رہی تھی اور اپنے لوک پلک اور آب و رنگ کے اعتبار سے سبک ہندی کہلائی۔ . . . . . .

اردو میں فارسی آمیزی غالب اور اقبال دونوں نے کی۔ اس فرق کے ساتھ کہ اردو میں غالب کے لائے ہوئے فارسی الفاظ کھٹکتے نہیں۔ جیسے

---

[1] از "عزیزان ندوہ کے نام" پروفیسر صاحب نے خطبۂ صدارت ۳۰ ستمبر ۱۹۶۷ء کو دارالعلوم ندوہ لکھنؤ میں تقسیم اسناد کے موقع پر دیا۔

اردو میں امتزاج نہ پا سکے ہوں۔ اقبال کی اُردو میں وُہ اس خوبی سے ترکیب پا گئے ہیں جیسے وہ لفظ فقرہ یا عبادت اُردو کے منجملہ اسباب "حُسن" ہو اور ظاہر ہے جو چیز اُردو سے ربط پا جائے گی وہ "بچشم مست ساقی دام کردن" کا کیا نمونہ پیش کرے گی۔ تعجب اس کا ہے کہ اُردو اور فارسی سے غالبؔ جتنے آشنا تھے اور زبان کی جس ٹکسال میں وہ رہتے تھے اقبال کو نصیب نہ تھیں۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ اعلیٰ شاعری کی زبان اہلِ زبان نہیں بلکہ اعلیٰ موضوعات کا اعلیٰ شاعر متعیّن کرتا ہے۔

غالبؔ نے اُردو غزل کو ایک بیا شعور۔ ایک بیا نسب اور ایک بیا افق دیا۔ غالبؔ کے تصرّف سے غزل اُردو کی تاثیر اور تقدیر بنگئی۔ اُردو نثر پر بھی غالبؔ کا یہی احسان ہے۔ غالبؔ نے غزل کی ممکنات کا اِنکشاف کیا اور اس کو ایسی فضاؤں سے آشنا کیا جہاں اُردو شعر و ادب کو پورے طور پر پنپنے اور پھولنے پھلنے کا موقع ملا۔ بقول ایک فاضل کے انہوں نے اُردو شاعری کے نسب کو ولی پر ختم ہو جانے کی بجائے فارسی شعراء سے ملا کر رودکی تک پہونچا دیا۔ غالبؔ نے شاعری کے ساتھ وہی کیا جو امیر خسروؔ نے موسیقی کے ساتھ کیا۔ غالبؔ اور امیر خسرو دونوں ہندوستان اور ایران کی ذہانت و فطانت کے بڑے ممتاز نمائندے تھے۔ انھوں نے دونوں ملکوں کے بہترین کو باہم گرمربوط۔ مزیّن و محکم کیا۔ اگر آپ غالبؔ کے اس کارنامہ کو پہچاننا چاہتے ہیں تو حالیؔ اور اکبرؔ کے دلبستانوں سے اقبالؔ تک پہونچنے کی کوشش کریں۔ غالبؔ نے ایسا نہ کیا ہوتا تو اُردو شاعری اربابِ نشاط اور قوالوں سے آگے نہ بڑھتی غالبؔ سے جن دھاروں کے شروع ہونے کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے اُن میں ایک وہ ہے جس میں غزل کم و بیش اپنی روایتی وضع قطع اور سج دھج سے آگے بڑھتی ہے۔ دوسرا وہ ہے جہاں غزل وہ رنگ اختیار کر لیتی

ہے جو غزل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ اور ہے۔ اس میں غزل زندگی۔ زمانہ اور ذہن تینوں سے ساز دستیز کرتی آگے بڑھتی ہے اور بالآخر اقبال کے فیضان سے شاعری کی "زندہ رود" بن جاتی ہے[1]

بڑے شاعر کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ جس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرے اُس کے ان اعلیٰ امکانات کو واضح اور متعین کر دے جو اس سے پہلے نامعلوم یا ناممکن سمجھے جاتے تھے۔ غزل میں یہ کارنامہ غالب اور اقبال کا ہے۔ ترقی پسند شاعری بھی اپنے غالب اور اقبال کے انتظار بابنی اسرائیل اپنے موسیٰ کی تلاش میں ہیں جن کے بغیر نہ اُمت کی نجات ہے نہ فن کی نمود۔[2]

غالب۔ حالی اور اکبر کی شاعری میں روایتی محبوب کا غلبہ نہیں ملے گا۔ اقبال اور رومی کی شاعری میں یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ انھوں نے اپنے لئے گوشت و پوست کے محبوب نہیں منتخب کئے ہیں۔ بلکہ ہمارے آپ کے فکر و عمل کے لئے موضوع اور میدان منتخب کئے ہیں[3]

..... اقبال نے ریزہ خیالی سے بھی کام لیا ہے اور خوب لیا ہے اور اُن کی نظمیں مُدتوں سوچے اور مطالعہ کئے ہوئے افکار کا بھی اظہار کرتی ہیں۔ اُن کی غزلوں میں اُن کی نظموں کی پرچھائیں ملتی ہے۔

ایک حد تک یہی بات غالب کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے باوجود اس کے کہ انھوں نے ایک آدھ مسلسل اُردو و فارسی نظموں

---

[1] جدید غزل ص ۶۱ تا ۶۲ [2] ،، ،، ص ۲۳ [3] ،، ،، ص ۷۵ تا ۷۶

سے قطع نظر کوئی مُستقل چیز ایسی نہیں لکھی ہے جس سے کسی مخصوص پیام یا مسلک کا اظہار ہوتا ہو۔ بایں ہمہ ان کی غزلوں میں اُن کی مخصوص طرزِ فکر یا اندازِ زندگی کی جھلک ملتی ہے کہنا یہ ہے کہ اچھا شاعر ہو تو باوجود ریزہ خیالی (یا غزل گوئی) جینیئس (Genius) آشکار ہو کر رہتی ہے [1]

---

[1] "دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے"، از پروفیسر رشید احمد صدیقی ص ۸۵
رسالہ فکر و نظر۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔ جولائی ۱۹۶۳ء

مُتفرّقات

. . . . . اقبالؔ پر لکھنے سے اکتا نہیں سکتا، جب تک زندگی سے نہ اکتا جاؤں۔ اور آپ تو جانتے ہیں مُسلمان زندگی سے کبھی نہیں اکتاتا بالخصوص ایسے حالات میں جب لکھنا پڑھنا پیشہ ہو اور فرمائش کرنے والے وہ لوگ ہوں جو مرشد (ذاکر صاحب) کے دست و بازو ہوں۔

تیری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

اقبالؔ کے اس شعر سے اقبالؔ کی شخصیت اور اُن کے پیام کی اہمیت کا اندازہ کیجئے۔ [1]

"جنگ طرابلس کا زمانہ تھا۔ دسویں، پندرھویں اقبالؔ کا ترانہ پڑھتا ہوا شہر سے جلوس گزرتا . . . . . پڑھنے کا انداز اتنا موثر اور پُرقار ہوتا کہ رگ و پے میں بجلیاں کوندتی معلوم ہوتیں۔ ہندو مسلمان۔ مرد عورت، بوڑھے بچے۔ سب غور و احترام سے سنتے۔ تھوڑی دیر کے لئے کاروبار کا ہمہمہ تھم جاتا۔ جلوس گذر جاتا تو لوگوں کی زبان پر ترکوں کی بہادری اور یورپین طاقتوں کی ظلم و زیادتی کا چرچا ہوتا ۔ اقبالؔ سے غائبانہ شغف مجھے اس جلوس اور ترانے سے ہوا۔ گو یہ بھی یاد آتا ہے کہ جون پور کی پبلک لائبریری کے برآمدے میں ایک شام اقبالؔ کی نظم۔

"خدا سے سن نے اک روز یہ سوال کیا"

---

[1] مدیر "جوہر"، جامعہ ملیہ۔ دہلی (محمد حسین سید) جوہر شمارہ خصوصی بیادگار علامہ اقبالؒ نومبر ۱۹۳۸ء ص ۲۹ بار اول (برائے فرمائش مضمون)

ایک صاحب نے بڑے پُر اثر انداز سے سنائی تھی محفل پر دیر تک سکوت طاری رہا۔ بعض حضرات آبدیدہ ہو گئے تھے اور "رہے نام اللہ کا" کہتے ہوئے یکے بعد دیگرے اٹھ کھڑے ہوئے اور محفل خاموشی سے برہم ہو گئی"۔ [۱]

"اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجیے۔ حاتم طائی کے کوہِ ندا کی مانند وہ بھی اپنی پہلی آواز پر آپ کو کشاں کشاں اپنے قدموں میں لا ڈالیں گے اور آپ سے کچھ بن نہ پڑے گا۔ ۔ ۔ ۔ اور آپ کو سیر موادِ صرا اُدھر نہ ہونے دیں گے۔ ۔ ۔ ۔ اقبال حکومت کرتے ہیں۔ اپنی وادی کے امام ہیں الفاظ کے انتخاب اور اُن کے در و بست کے اہتمام میں انتہائی احتیاط اور صناعت کاری کو دخل دیتے اور سلیقہ و شرافت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے"۔ [۲]

"فارسی اور اردو نظم میں رومی اور اقبال نے حرارتِ دینی۔ علمی۔ عصری بصیرت۔ شاعرانہ حسن کاری اور قدرتِ فن سے کلام کو متعارف کیا۔ اس کی جھلک کہیں ملتی ہے تو ڈانٹے اور ملٹن کی نظموں میں"۔ [۳]

"پہلی جنگِ عظیم کے آس پاس کے زمانہ میں علوم و فنون کے کتنے اور کیسے جامع کمالات ہونہار نوجوان لاہور میں نظر آتے ہیں۔ جن میں "جوانانِ سعادت مند" کے "پیر دانا"۔ سر شیخ عبدالقادر۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال سب سے نمایاں نظر آتے ہیں"۔ [۴]

---

[۱] آشفتہ بیانی میری۔ صفحات ۳۰-۳۱ (یہ واقعہ ان کے اسکول کے طالب علمی کا ہے۔
[۲] گنجہائے گرانمایہ (در ذکر اصغر گونڈوی) ص ۱۲۹
[۳] ہم نفسانِ رفتہ (در ذکر ابوالکلام آزاد) ص ۱۱۵
[۴] ہم نفسانِ رفتہ (در ذکر پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس) ص ۱۴۴

"فی الحال یہ کہنا ہے کہ ڈسپلن کا تمامتر مدار فرائض کے احساس پر ہے اور یہ احساس پائدار و موثر اسی وقت ہوتا ہے جب اس کی اساس کسی "کلمہ گیتی نورد" پر ہو۔ اقبال نے ملت کی تعبیر و توثیق اس کلمہ گیتی نورد سے کی ہے جس کا اعلان ان سے پہلے ایک بدوی کر چکا تھا۔" [۱]

"غزل نے اردو زبان اور شعر و ادب کو ہمسایہ زبانوں میں ممتاز بنانے اور اس کو ناقابلِ تسخیر کر دینے میں جو حصہ لیا ہے اور ترقی پسند ادب کی یلغار کو پسپا کرنے اور ناکام بنانے میں جو رول ادا کیا ہے اس سے انکار کرنا سہل نہیں۔ پھر اقبال نے اپنے گراں بہا تصرف سے غزل کو جہاں پہونچا دیا ہے اس کا احساس و اعتراف ہم سے زیادہ غالباً ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کو ہوگا۔ [۲]

"جگر صاحب کو میں نے شاعری پر بحث کرتے بھی سنا ہے۔ وہ شاعری پر بحث نہیں کر سکتے۔ اپنی پسند کے اشعار پر وجد کر لیتے یا جھگڑ لیتے۔ وہ اقبال کی شاعری کے کچھ زیادہ قائل نہیں ہیں۔ فانی بھی نہ تھے۔ جگر اور فانی دونوں کا شاعری کا نقطۂ نظر شخصی اور شاعرانہ ہے۔ غزل گوئی میں ہوتا بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ شاعری شخصی بھی ہوتی ہے۔ آفاقی بھی۔ میں دونوں کا قائل ہوں۔ لیکن سر اسی کے آگے جھکاتا ہوں جس کے یہاں دونوں میں تمیز کرنا دشوار ہو جائے۔ جگر صاحب اقبال کے قائل ہوں یا نہیں لیکن جہاں وہ جہت سے گذر کر جہاں میں داخل ہوتے ہیں وہاں اقبال سے ان کو مفر نہیں ہوتا۔ اقبال سے بس اردو شاعر کو اب مفر ہے۔" [۳]

---

[۱] عزیزان ندوہ کے نام ص ۲۹ [۲] عزیزان ندوہ کے نام ص ۵۶ [۳] آتش گل ص ۱۶-۱۷ جگر میری نظر میں مقدمہ۔

"حقیقی اور بڑی شاعری شاعر کا انفرادی، یگانہ اور لازوال کارنامہ ہوتا ہے۔ برخلاف سائنس کے کارناموں کے جو مشترکہ محنت اور تحقیقات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ایٹم بم بنانے میں معلوم نہیں کتنے سائنسدان اور سائنس کے کارپرداز شریک رہے ہوں گے۔ لیکن اقبال کی نظم "تنہائی"، "مسجد قرطبہ"، یا "ساقی نامہ" صرف اقبال کے کارنامے ہیں۔ میرا مقصد یہاں سائنس کی اہمیت و عظمت سے انکار نہیں ہے۔ صرف شاعر کا منصب جتانا ہے" [۱]

"حالی۔ اکبر۔ اقبال کا نام لے کر آج کل کے منچلے ہر صدائے بے ہنگام کو جدت طرازی سمجھتے ہیں" [۲]

"حالی کا مرثیۂ غالب اور اقبال کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" ایسی نظموں کو یاد دلاتے ہیں اور نمونے پیش کرتے ہیں جہاں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مرحوم کی مفارقت کے کرب کے سوا محروم نے کوئی اور وسیلۂ اظہار مثلاً زبان و بیان۔ صنائع بدائع۔ صوت و صورت۔ نقل و حرکت اختیار کیا ہو۔ اظہار و ابلاغ کی کامیابی کی یہ معراج ہے۔ فن کا کمال ہی یہ ہے۔ کہ فن کے سارے وسائل کام میں لائے گئے ہوں لیکن ان میں ایک بھی توجہ پر بار نہ ہو" [۳]

"سرسید مسلمانوں کو ملاؤں کی گرفت سے نکالنا چاہتے تھے یہی مہم اقبال کے سامنے تھی۔ دونوں کا زمانہ اور دونوں کا طریقۂ کار مختلف تھا۔ حال کو سدھارنے کے لئے کبھی کبھی ماضی کو سدھارنا پڑتا ہے۔ مذہب اور اخلاق

---

[۱] آتش گل۔ مقدمہ۔ جگر میری نظر میں ص ۱۳ [۲] باقیات فانی مقدمہ ص ۵۷
[۳] صدارت۔ دوم۔ دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۹ء ص ۱۴۰

کے مُعلمین و مُصلحین کو اکثر یہ منازل طے کرنا پڑے ہیں۔ . . . . . مذہب کی بنیادی اور فروعی باتوں میں امتیاز کرنے میں اکثر غلطی ہوئی ہے جس کی تلافی کی کوشش ہمیشہ کی جائے گی۔ [1]

آزاد۔ حالی۔ شبلی۔ اکبر۔ اقبال چکبست۔ اسمٰعیل میرٹھی کا تقریباً ایک ہی عہد ہے۔ ایسے تخمینوں میں دس پندرہ سال کے تفاوت کو میں زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ حالی نے دل کھول کر غزل کی مُذمّت ایسے الفاظ اور لب ولہجہ میں کی کہ میرا خیال ہے زندگی میں شاید ہی انھوں نے کسی اور کی کی ہو گی۔ لیکن مُسلّمہ طور پر وہ بڑے اچھے غزل گو بھی تھے۔ یہاں تک کہ ہم میں سے اکثر اس کے قائل ہیں کہ اُن کی غزلیں اُن کی نظموں سے بہتر ہیں۔ حالی۔ شبلی اکبر اور اقبال اعلیٰ پائے کے نظم نگار ہونے کے علاوہ اتنے ہی اچھے غزل گو تھے وہ جانتے تھے کہ "غزل ہم عالمے دارد"

اقبال ایسا اعلیٰ پایہ کا نظم گو سمُندر اور اس کے تموّج دونوں کو دیکھتا ہے۔ غزل گو سمندر کو نظر انداز تو نہیں کرتا لیکن اپنی توجہ کو زیادہ تر سمُندر کی مختلف اور مُتفرق موجوں پر مرکوز رکھتا ہے۔ اور اچھا غزل گو خوب جانتا ہے کہ بیرونِ دریا موج کی کوئی حقیقت نہیں۔ [2]

---

[1] آشفتہ بیانی میری ص ۵۳

[2] دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے" ص ۸۷ رسالہ فکر و نظر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ جولائی ۱۹۶۳ء